www.urduchannel.in

تاریخِ ادبِ اردو

حصہ نثر

پروفیسر نورالحسن نقوی

اردو چینل
www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

۱

اردو نثر کا آغاز

اردو نثر کی باقاعدہ شروعات دکن سے ہوئی۔ یہ البتہ درست ہے کہ بول چال کی زبان وہاں شمالی ہند سے ہی پہنچی۔ علاء الدین خلجی پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس کی فوجیں دکن پہنچیں اور وہاں کے بہت بڑے علاقے پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ یہ بات تیرہویں صدی عیسوی کی ہے۔ ان فوجوں کے ساتھ ہر طرح کے لوگ تھے۔ ان میں صوفی بھی تھے اور مختلف پیشہ ور بھی۔ یہ سب اپنے ساتھ بول چال کی ایک کھچڑی زبان لے گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے صوفی، درویش، تاجر اور پیشہ ور وہیں بس گئے اور یہی ملی جلی بولی بولتے رہے۔ اس زبان پر پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی کا اثر تھا اور اس میں عربی فارسی کے بہت سے لفظ بھی شامل تھے۔ یہ زبان ہندی، ہندوستانی، دکنی مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی۔

چودھویں صدی عیسوی میں اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا جب محمد تغلق نے دیوگری کو دولت آباد نام دے کر اپنا دارالسلطنت بنایا۔ دلّی کے زیادہ تر باشندوں کو اس کے ساتھ دکن جانا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد دارالسلطنت پھر شمالی ہند کو منتقل ہو گیا لیکن صوفیا، فقرا، اہلِ حرفہ اور دوسرے لوگوں کی بہت بڑی تعداد ایسی تھی جنھوں نے وہیں بس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح شمالی ہند کی ملی جلی بولی کو، جسے آگے چل کر ہندی، ہندوستانی، دکنی کہا گیا، دوسری بار دکن میں قدم جمانے کا موقع ملا۔

www.urduchannel.in

چودھویں صدی کے آخر میں دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہوگئی۔ بول چال کی اس زبان کو جو آج اردو کہلاتی ہے۔ بہمنی سلطنت کے زیر سایہ پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ تاریخ فرشتہ سے پتا چلتا ہے کہ وہاں سرکاری کاموں کے لیے یہی زبان استعمال ہوتی تھی۔ وہاں اسے مقبول بنانے میں صوفیائے کرام کا بڑا ہاتھ ہے۔

ان صوفیوں میں پہلا نام خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا ہے۔ شمالی ہند میں ان کے مرید ہر طرف موجود تھے مگر اپنے پیام محبت کو عام کرنے کے لیے انھوں نے دور دراز کا سفر کیا اور ۱۳۹۹ء میں دلّی سے گلبرگہ پہنچے۔ یہاں ان کے عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا ہوگیا جن کی رہنمائی کے لیے وہ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ اس وعظ کی زبان بول چال کی عام زبان ہوتی تھی جو اس وقت ہندی یا دکنی کہلاتی تھی اور آج اردو کہی جاتی ہے۔ ان کے اقوال اور نصائح نے تحریر کی شکل بھی اختیار کی۔ اس طرح متعدد کتابیں وجود میں آئیں مگر زمانے کے ہاتھوں برباد ہوگئیں۔ ایک کتاب "معراج العاشقین" موجود ہے جو ان کے نام سے منسوب ہے۔ اسی طرح "شکار نامہ" اور "تلاوت الوجود" وغیرہ اور بھی کئی کتابیں ہیں مگر اہلِ نظر کا خیال ہے کہ یہ بعد کو کسی زمانے میں لکھی گئیں اور غلط طور پر خواجہ بندہ نواز کے نام سے منسوب کر دی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بیٹے اکبر حسینی نے بھی تصوف کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں لیکن یہ بات بھی یقینی نہیں ہے۔

یہ بات بہرحال یقینی ہے کہ بیجاپور کو ایک بزرگ میراں جی شمس العشاق نے اپنے تبلیغی کام کا مرکز بنایا۔ اپنے مرشد کمال بیابانی کی ہدایت پر انھوں نے اپنے تبلیغی افکار کو بول چال کی عام زبان (یعنی اردو) میں قلم بند کیا۔ وہ خود اپنی زبان کو ہندی کہتے ہیں۔ کئی مختصر کتابیں ان سے منسوب ہیں۔ ان میں سب سے اہم "مرغوب القلوب" ہے۔ میراں جی نے جو سلسلہ شروع کیا تھا اسے ان کے بیٹے برہان الدین جانم نے جاری رکھا۔ "کلمۃ الحقائق"، "ہشت مسائل" اور "ذکر جلی" ان کی نثری تصانیف ہیں۔ وہ اپنی زبان کو کہیں گوجری اور کہیں ہندی کہتے ہیں۔ ان کے بیٹے خلیفہ امین الدین اعلیٰ نے تبلیغ کے اپنے خاندانی انداز کو جاری رکھا۔ اس خاندان سے عقیدت رکھنے والوں نے ان سے بھرپور تعاون کیا۔ جنوبی ہند میں مختلف مقامات پر خانقاہیں قائم ہوگئیں۔ صوفیا کا پیام محبت دور تک پھیل گیا اور اس کے ساتھ ہی اردو کی اس ابتدائی شکل نے دکن میں خوب فروغ پایا۔ "گنج مخفی" ان کی مشہور تصنیف ہے۔ اعلیٰ کے بعد ان کے شاگردوں نے قابلِ قدر خدمت انجام دی۔

❖ ❖ ❖

اردو نثر کے فروغ میں سترہویں صدی کو سنگ میل کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس صدی کے وسط میں دکن کے ایک نامور شاعر و نثر نگار وجہی نے اپنی تخلیقات کے انمول سرمایے سے اردو ادب کو مالا مال کر دیا۔ انھوں نے ۱۶۳۵ء میں اپنی نثری تصنیف "سب رس" مکمل کی۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے تصنیف نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ یہ ایک فارسی کتاب کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ یہ ایک تمثیل ہے۔ مطلب یہ کہ چند چیزوں کو جسم عطا کر کے انھیں قصّے کہانی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ حسن اور عشق، عقل اور دل، قلب اور نظر وغیرہ کو مجسم مان کر ایک ایسی داستان پیش کی گئی ہے جس سے اخلاق کی تعلیم ملتی ہے۔ سب رس کا اسلوب مقفّیٰ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں غیر معمولی سادگی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ وجہی نے درست ہی لکھا ہے کہ "آج لگن کوئی اس جہان میں، ہندوستان میں، ہندی زبان میں، اس لطافت اس چھنداں سوں، نظم ہور نثر ملا کر، گلا کر یوں نیں بولیا، اس نبات کو یوں کوئی آب حیات میں نیں گھولیا، یوں غیب کا علم نیں کھولیا۔" غرض مواد اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے ملا وجہی کی سب رس قدیم اردو نثر کا شہکار ہے۔

دکن میں سب رس کے بعد بھی نثری تصانیف کا سلسلہ جاری رہا۔ مذہب و تصوف کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی گئیں۔ پنج تنتر اور ہتوپدیش کی کہانیوں کو "طوطی نامہ" کے نام سے پیش کیا گیا۔ یہ ترجمے براہِ راست نہیں بلکہ فارسی سے کیے گئے لیکن ان

www.urduchannel.in

قدیم اردو نثر کا ایک اہم نمونہ سودا کا دیباچہ ہے جو انھوں نے اپنے مجموعۂ مراثی پر لکھا ہے۔ اس پر فارسی نثر کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ زبان مقفّیٰ ہے اور فارسی عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ اس کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

> "ضمیر پر آئینہ دارانِ معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطیِ ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرعے کہ از قبیلِ ریختہ در ریختۂ خامۂ دو زباں اپنی ہے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے۔"

افعال بے شک اردو کے ہیں لیکن اس پر فارسی زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس زمانے کے فارسی نثر نگاروں کی طرح لفاظی اور عبارت آرائی زیادہ ہے، مطلب کی بات کم۔ زبان ایسی مشکل ہے کہ مفہوم تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔

سودا نے میر تقی میر کی مثنوی شعلۂ عشق کو بھی اردو نثر میں منتقل کیا تھا جو اب دستیاب نہیں۔ اس لیے اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی جا سکتی۔

❖ ❖ ❖

قدیم اردو نثر کے ارتقا میں کلام پاک کے دو تراجم کا ذکر بھی ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلی کے ایک لائق احترام بزرگ تھے۔ کلام پاک کے یہ دونوں ترجمے ان کے دو بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے قلم سے ۱۷۸۶ء اور ۱۷۹۰ء میں وجود میں آئے۔ مقصد یہ تھا کہ عربی سے واقفیت نہ رکھنے والے قرآن شریف کے مطالب سے واقف ہو سکیں۔ یہ بہت نازک کام تھا۔ مترجمین کی ساری توجہ اس پر رہی کہ مطلب بالکل صحیح ادا ہو۔ اس لیے ترجمے کی روانی کا خیال نہیں رکھا جا سکا۔ آگے چل کر ایسے ترجمے بھی ہوئے جن کی ادبی حیثیت مسلم ہے لیکن اردو نثر کے ارتقا میں متذکرہ بالا دونوں ترجموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

❖ ❖ ❖

اردو نثر کی ترقی میں صوبۂ بہار نے بھی قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ زمانۂ قدیم سے لے کر

کتابوں کو کوئی خاص ادبی مرتبہ حاصل نہیں۔

❖ ❖ ❖

ادھر شمالی ہند میں اردو کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ بول چال کی زبان کے طور پر تو اس نے ایسا مقام حاصل کر لیا کہ کوئی اور زبان اس کے مدمقابل نہ رہی لیکن اہلِ قلم فارسی زبان میں لکھنے کو ہی باعث افتخار سمجھتے رہے۔ اورنگ زیب اور بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں میر جعفر زٹلی نے فارسی اور اردو کی ملی جلی زبان میں جو مزاحیہ انداز کے شعر کہے یا بول چال کی نثر میں جو چھوٹے چھوٹے فقرے اور جملے کہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نئی زبان اپنی مقبولیت اور توانائی کا ثبوت دینے لگی تھی۔

فضل علی فضلی کی "کربل کتھا" شمالی ہند کی پہلی نثری کتاب ہے جو ۱۷۳۱ء میں مکمل ہوئی۔ سترہ سال بعد فضلی نے اس پر نظر ثانی کی۔ اس وقت دستور تھا کہ محرّم کی مجلسوں میں ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب "روضۃ الشہدا" پڑھی جاتی تھی جسے عام لوگ نہیں سمجھ پاتے تھے۔ فضلی نے اسے عوام کی زبان میں منتقل کر دیا۔ اس میں کربلا کے واقعات اور شہادت کا پر درد بیان ہے۔ مصنف کا مقصد کوئی ادبی شہکار پیش کرنا نہیں ہے۔ اصل مدعا حصول ثواب ہے لیکن غیرارادی طور پر انھوں نے ایک ایسی کتاب پیش کر دی جسے اردو نثر کے ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

کربل کتھا میں فارسی عربی کے بہت سے لفظوں کا استعمال ہوا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ کسی مذہبی کتاب میں فارسی عربی کے الفاظ سے بچنا ممکن ہی نہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس زمانے میں شمالی ہند کی بول چال میں کثرت سے ان دونوں زبانوں کے لفظ استعمال ہوتے تھے۔ کربل کتھا میں دکنی اردو کے کچھ لفظ اور محاورے بھی پائے جاتے ہیں۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ اندازہ لگایا کہ فضلی دکن کے رہنے والے تھے لیکن یہ خیال بے بنیاد ہے۔

❖ ❖ ❖

www.urduchannel.in

عہد حاضر تک اردو زبان اس خطۂ ہند کے احسان سے گراں بار ہے کہ یہاں تسلسل کے ساتھ اردو شعر و ادب کی خدمت کی جاتی رہی ہے۔ سترہویں صدی عیسوی سے ہی یہاں اردو نثر اور اردو نظم کے نمونے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی تخلیقات زیادہ تر مذہبی نوعیت کی ہیں۔ ان میں شاہ عماد پھلواروی کا نثری رسالہ سیدھا رستہ، ظہور کا رسالۂ نماز اور محمد اسحاق کا رسالۂ معیۃ خاص طور پر اہم ہیں۔

٭ ٭ ٭

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں اردو نثر کی جو سب سے اہم کتاب وجود میں آئی وہ میر حسین عطا تحسین کی نوطرزِ مرصع ہے۔ یہ ایک فارسی داستان قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ تحسین کا وطن اٹاوہ تھا لیکن ملازمت کے سلسلے میں کافی عرصہ کلکتہ میں قیام رہا۔ وہ ایک انگریز فوجی افسر کے میر منشی تھے۔ اس افسر کے ولایت واپس جانے کے بعد تحسین نے فیض آباد کا رخ کیا۔ فارسی زبان و ادب کا اچھا علم رکھتے تھے۔ اسی کی بدولت نواب شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔

تحسین کئی فارسی کتابوں کے مصنف ہیں مگر جس کارنامے نے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا وہ "نوطرزِ مرصع" ہے۔ اس کا اسلوب رنگین اور مقفّیٰ ہے۔ فارسی عربی الفاظ کی بھرمار نے اسے مشکل اور عام لوگوں کے لیے ناقابلِ فہم بنا دیا ہے۔ تاہم اردو نثر کی تاریخ میں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ "نوطرزِ مرصع" کی عبارت کا انداز یہ ہے۔

"بیچ سرزمینِ فردوس آئین ولایت روم کے ایک بادشاہ تھا، سلیماں قدر، فریدوں فر، جہاں باں، دین پرور، رعیت نواز، عدالت گستر، برآرندۂ حاجاتِ بستہ کاراں، بخشندۂ مراداتِ امیدواراں، فرخندہ سیر نام کہ اشعۂ شوارق فضل ربانی کا اور شعشۂ بوارق فیض سبحانی کا ہمیشہ اوپر لوحِ پیشانی اس کے لمعاں و نور افشاں رہتا۔"

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ عزت نے اپنے کلیات پر اردو میں ایک دیباچہ لکھا۔ اس کے علاوہ ویلور کے ایک شاعر اور نثر نگار محمد باقر آگاہ نے اپنی اکثر شعری تخلیقات پر اردو میں دیباچے لکھے۔ ان کی ایک نثری اردو تصنیف "ریاض السیر" ہے جس کا اسلوب سادہ ہے۔

یہ ہے اٹھارہویں صدی عیسوی تک اردو نثر کے ارتقا کی مختصر کہانی۔

---

www.urduchannel.in

(۲)

فورٹ ولیم کالج

مغل سلطنت کمزور ہونے کے ساتھ ہی بدیسی طاقتوں نے ہندوستان پر قبضہ جمانے کے لیے ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔ انگریز، فرانسیسی اور پرتگیزی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ بالآخر ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور شمالی ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہو گیا۔

یورپی اقوام نے بہت پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان زیادہ دنوں مغلوں کے زیر نگیں نہ رہ سکے گا اور کوئی یورپی قوم ہی اس پر حکمراں ہوگی۔ اس حقیقت سے بھی سب واقف تھے کہ حاکم قوم کو آخر کار ہندوستانی زبانوں سے واقفیت ضروری ہوگی۔ اس وقت فارسی حکومت کی زبان تھی۔ ایک طبقے کی زبان سنسکرت تھی لیکن ایک بول چال کی زبان تھی جسے سارے ملک میں بولا اور سمجھا جاتا تھا۔ یہ اردو زبان تھی جسے ہندی اور ہندوستانی زبان بھی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ بعض بدیسیوں نے اس زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی نیز اپنے ہم وطنوں کو اسے سکھانا چاہا۔ سب سے پہلے ایک ڈچ جوشوا کیٹلر نے ۱۷۱۵ء میں ہندوستانی زبان کی قواعد سے متعلق ایک چھوٹی سی کتاب لاطینی زبان میں لکھی۔ ایک پادری بنجمن شلز نے ۱۷۴۴ء میں ایک قواعد لکھی اور ۱۷۴۸ء میں انجیل کا اردو میں ترجمہ کیا۔ گلسٹن، ہڈلے اور فرگوسن کے نام بھی قابل ذکر ہیں لیکن سب سے اہم کام ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ہے۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھے اور ۱۷۸۳ء میں ہندوستان آئے۔

ہندوستانی قواعد اور لغت کے سلسلے میں انھوں نے نہایت بیش قیمت کام کیا۔

ان سب کاموں نے ہندوستانی زبانوں کو سیکھنے کے لیے راستہ ہموار کر دیا تھا لیکن انگریز تاجروں نے سمجھ لیا تھا کہ ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے کام نہیں چلے گا۔ اب ہندوستانی کتابوں کو سیکھنے کا باقاعدہ بندوبست کرنا ہوگا۔ چنانچہ جنوری ۱۷۹۹ء میں کلکتہ میں اورینٹل سمینری کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں انگلستان سے آنے والے انگریز افسروں کو اتنی ہندوستانی سکھادی جاتی تھی کہ وہ منشی سے فارسی پڑھ سکیں۔ آخر اس کو بھی ناکافی سمجھا گیا۔ ہندوستان کے مغل شہنشاہ شاہ عالم نے بنگال اور بہار کی مالگذاری وصول کرنے کا کام ایسٹ انڈیا کمپنی کو سونپ دیا تھا۔ اس لیے نووارد انگریز افسروں کے لیے ہندوستانی زبانوں کی واقفیت زیادہ ضروری ہو گئی تھی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے گورنر جنرل نے کلکتہ میں ایک کالج قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔

لارڈ ولزلی کا منصوبہ ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو منظور ہوا لیکن اس پر ۴ مئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی گئی ہے۔ ۴ مئی کو سرنگاپٹنم کی جنگ میں سلطان ٹیپو کو شکست ہوئی تھی اور ولزلی اس تاریخ کو انگریزی ہندوستان کی تاریخ میں امر کر دینا چاہتا تھا کیوں کہ اسی دن یہ فیصلہ ہوا تھا کہ آئندہ ملک کے حکمراں انگریز ہوں گے۔ اور اسی دن یہ بات سمجھ لی گئی تھی کہ ملک پر راج کرنے کے لیے ملک میں بولی جانے والی زبانوں کو سمجھنا ضروری ہوگا۔ ۴ مئی ۱۸۰۰ء اس کی پہلی سالگرہ تھی۔

یہ کالج فورٹ ولیم نام کے قلعے میں قایم ہوا اس لیے فورٹ ولیم کالج کہلایا۔ لارڈ ولزلی نے کالج کے معاملات میں بہت دلچسپی لی۔ انھوں نے کالج میں بہت سے شعبے قایم کیے اور لائق استادوں کا انتخاب کیا۔ کالج کے پہلے پروسٹ (پرنسپل) ڈیوڈ براؤن مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ ہندوستانی زبان کے شعبے کے صدر منتخب ہوئے۔ ہندوستانی زبان سے اس وقت اردو زبان مراد لی جاتی تھی۔ گلکرسٹ بہت ذہین اور محنتی انسان تھے۔ انھوں نے بڑی محنت سے علم حاصل کیا تھا، بہت شوق کے ساتھ اردو زبان سیکھی تھی اور کئی کتابیں لکھی تھیں۔ بعد کو وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

www.urduchannel.in

"جس گاؤں میں اور جس شہر میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا وہاں میں نے اس زبان (یعنی اردو) کو مقبول پایا۔"

گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں رہ کر اردو زبان کی زبردست خدمت کی۔ انھی کی کوشش سے کالج کے ساتھ ساتھ ایک بڑا کتب خانہ اور پریس بھی قائم کیا گیا تھا جس میں نستعلیق ٹائپ سے کتابیں چھاپی جاتی تھیں۔

جب کالج شروع ہوا اور اردو پڑھانے کا وقت آیا تو ایک اور دشواری سامنے آئی۔ معلوم ہوا کہ اردو میں ایسی کتابیں موجود نہیں جو کالج میں پڑھائی جا سکیں۔ اب ان اہل قلم کی تلاش شروع ہوئی جو کتابیں لکھنے کا کام انجام دے سکیں۔ مصنفین کی خدمات حاصل کرنے کے لیے اشتہار جاری کیا گیا۔ اس طرح گلکرسٹ کی کوشش سے کلکتہ میں سارے ملک کے ایسے اہل قلم جمع ہو گئے جو کتابیں لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان میں میر امّن، میر شیر علی افسوس، میرزا علی لطف، میر بہادر علی حسینی، میر حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، للّو لال جی اور بینی نراین جہاںؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتابیں تیار ہونے لگیں تو انھیں چھاپنے کے لیے کتب خانہ اور پریس قایم کیے گئے۔ گلکرسٹ کی سفارش پر کالج میں قصہ خواں ملازم رکھے گئے جو نو وارد انگریزوں کو آسان زبان میں قصے سنا کر اردو کا ذوق بھی پیدا کر دیتے تھے اور انھیں لفظوں کے درست تلفظ کی تربیت بھی دیتے تھے۔ غرض اردو کے اس محسن نے اردو زبان کے فروغ کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان کے بارے میں درست فرمایا ہے کہ:

"جو احسان وکی نے اردو شاعری پر کیا تھا وہی احسان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے۔"

گلکرسٹ کی خواہش تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کالج کی طرف زیادہ توجہ کرے اور اس کے اخراجات کے لیے زیادہ روپیہ منظور کرے مگر کمپنی کی نظر تجارت پر تھی۔ وہ روپیہ خرچ کرنا نہیں بلکہ

کمانا چاہتی تھی۔ آخر کار بد دل ہو کر ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے کالج سے استعفیٰ دے دیا اور جلد ہی وہ دن بھی آ گیا جب کالج ہی بند ہو گیا کیوں کہ کمپنی کا بورڈ آف ڈائرکٹرز کالج کے اخراجات سے عاجز تھا۔

فورٹ ولیم کالج بدیسیوں یعنی انگریزوں کو ہندوستانی زبان سکھانے کے لیے قائم ہوا تھا۔ اس لیے کالج میں جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ عام فہم، آسان اور بول چال کی زبان میں لکھی گئیں۔ میر امن نے اس پر فخر کیا ہے کہ انھوں نے باغ و بہار بول چال کی زبان میں لکھی ہے۔

یہ درست ہے کہ کالج میں اعلا درجے کی کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ قصے کہانیوں کی کتابوں پر زیادہ زور رہا اور ان میں بھی بیشتر تراجم ہیں۔ دراصل کالج کا مقصد محدود اور ضرورت واضح تھی۔ انھی کو پیش نظر رکھا گیا۔ یہ بھی درست ہے کہ کالج میں جو کتابیں لکھی گئیں کالج سے باہر اس وقت ان کا زیادہ چرچا نہیں ہو سکا لیکن ان کے اثرات دیرپا اور دور رس ثابت ہوئے۔

کالج کی کتابوں میں میر امن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرایش محفل، میرزا علی لطف کے تذکرہ گلشن ہند، میر شیر علی افسوس کی باغ اردو، میرزا کاظم علی جوان کے ڈراما شکنتلا اور للّو لال جی کی سنگھاسن بتیسی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

فورٹ ولیم کالج میں سنسکرت کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ یہاں سنسکرت کے قصے بول چال کی زبان میں سنائے جاتے تھے تاکہ اردو کے مصنف ان قصوں کو اپنی زبان میں لکھ لیں اور للّو لال جی جو سنسکرت کے ماہر تھے اس کام میں مدد کرتے تھے۔

فورٹ ولیم کالج لارڈ ولزلی کا لگایا ہوا پودا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ برقرار رہے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ انھوں نے ایک بار یہاں تک لکھا تھا کہ:

"اگر یہ کالج ختم ہو گیا تو انگریزی عملداری ہندوستان سے اٹھ جائے گی۔"

مگر ان کی رائے کو اہمیت نہیں دی گئی اور ۱۸۵۴ء میں اس کالج کو فضول شے سمجھ کر بند کر دیا گیا۔ اس کالج کی خدمات نے اردو نثر کے دامن کو وسیع کیا اور جو نثری سرمایہ یہاں وجود میں آیا

www.urduchannel.in

وہ ہمارے ادب کا انمول ذخیرہ ہے اور اس پر ہمیں ہمیشہ فخر رہے گا۔

فورٹ ولیم کالج کے مُصنّفین

ہندوستانی کے شعبے کے لیے اس زمانے کے چوٹی نامور اردو ہندی ادیبوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ میر بہادر علی حسینی چیف منشی منتخب ہوئے۔ ان کی تنخواہ دو سو روپے ماہانہ مقرر ہوئی۔ سکنڈ منشی کی جگہ پر سو روپے ماہانہ پر تارنی چرن متر کا تقرر ہوا۔ باقی منشیوں کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار تھی۔ طلبا کی تعداد میں اضافے کے ساتھ منشیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ایک خوشنویس، ایک ناگری نویس، ایک بھاکا نویس اور ایک قصہ خواں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ طلبا کو پڑھانے کے لیے "مسندی منشی" بھی موجود تھے۔ ان کا معاوضہ طالب علم خود ادا کرتے تھے۔ ۱۸۰۲ء میں ہندوستانی شعبے کے عملے کی تعداد ۴۸ تک پہنچ گئی۔ کالج کے اہم اہل قلم کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

میر امن جس زبان میں تصنع اور بناوٹ کا دور دورہ اور لفاظی و عبارت آرائی کا بول بالا تھا جس میں مقفیٰ اور مسجع عبارت کا دستور تھا، میر امن نے اس زبان میں باغ و بہار لکھ کر سادگی، صفائی اور سہل نگاری کا راستہ دکھایا۔ ضرورت ہے کہ ان کے بارے میں نہایت تفصیل سے لکھا جائے لیکن دشواری یہ ہے کہ باغ و بہار لکھنے سے پہلے میر امن گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے بارے میں صرف وہی معلومات دستیاب ہے جو خود انھوں نے اپنی کتابوں "باغ و بہار" اور "گنج خوبی" میں فراہم کر دی ہیں۔

میر امن کا نام میر امان تھا، آمن تخلص کرتے تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے اور وہاں ان کی آبائی جاگیر موجود تھی لیکن احمد شاہ ابدالی کے حملے میں سورج مل جاٹ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ میر امن دہلی کی سکونت ترک کر کے پٹنہ چلے گئے۔ کچھ دنوں وہاں قیام رہا۔ اس کے بعد کلکتہ پہنچے

کر کچھ وقت بے روزگاری میں گزارا۔ آخر میر بہادر علی حسینی کے ذریعے فورٹ ولیم کالج تک رسائی ہوئی اور منشی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔

انگریز افسروں کو اردو سکھانے کے لیے بول چال کی زبان میں قصہ کہانی کی کتابیں درکار تھیں۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی نظر ایک فارسی داستان چہار درویش کی طرف گئی۔ انھوں نے میر امن کو ہدایت کی کہ "اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ، ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے کبھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

چہار درویش کو تحسین "نوطرز مرصع" کے نام سے اردو میں منتقل کر چکے تھے لیکن اس کی زبان مشکل اور فارسی آمیز تھی۔ زبان زیادہ تر مقفیٰ تھی اس لیے اس کا سمجھنا دشوار تھا اور کالج کا مقصد تو اس سے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میر امن نے اسے آسان اور بول چال کی زبان میں ڈھال دیا۔ مقابلہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحسین کی نوطرز مرصع کے ساتھ ساتھ اصل فارسی کتاب بھی میر امن کے پیش نظر تھی۔

باغ و بہار کوئی طبع زاد تصنیف نہیں، ترجمہ ہے لیکن اسے اردو کے نثری ادب میں نہایت بلند مرتبہ حاصل ہے۔ اردو نثر کو لفاظی، عبارت آرائی، قافیہ اور وزن کی پابندی سے نجات دلانے کی طرف یہ پہلا انقلابی قدم تھا۔ باغ و بہار کی سادگی میں غضب کی دلکشی ہے۔ اس کی سادہ و بے تکلف نثر نے اردو کو ایک نیا راستہ دکھایا اور اہل قلم کو یہ احساس دلا دیا کہ سادگی کا حسن بناوٹی حسن سے زیادہ جاذبیت رکھتا ہے اور زبان اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب وہ رنگینی، پیچیدگی، لفاظی اور بناوٹ سے نجات پالے۔

باغ و بہار کی اسی خوبی کے اعتراف میں سرسید نے فرمایا تھا کہ "میر امن کو اردو نثر میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو میر تقی میر کو شاعری میں حاصل ہے۔ میر امن نے عربی فارسی الفاظ کے استعمال سے جہاں تک ہو سکا ہے پرہیز کیا ہے۔ انھوں نے قصداً عام بول چال کے الفاظ لانے

www.urduchannel.in

کی کوشش کی ہے۔ ہندی الفاظ کو بالعموم ترجیح دی ہے۔ مثلاً پیام کی جگہ سندیسہ، رونق کی جگہ روبٹ جیسے لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کتاب کی ایک عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

"اے بیرن تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔
تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہو جاتی ہوں۔"

میر امن نے تلفظ میں بھی عوامی بول چال کو اپنایا ہے جیسے جمعرات کی جگہ جمیرات، شب برات کی جگہ شبرات۔

باغ و بہار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے مطالعے سے اس زمانے کی معاشرت کا جیتا جاگتا مرقع پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے طور طریقے، کھانا پینا، لباس و زیورات، اخلاقی تصورات اس کتاب سے سبھی کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ ہماری زبان کی ایک سدا بہار کتاب ہے۔ اسے ہر دور میں شوق سے پڑھا جاتا رہا ہے اور پڑھا جاتا رہے گا۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔

میر امن نے ایک اور فارسی کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی "اخلاق محسنی" کا "گنج خوبی" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا لیکن یہ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔

سید حیدر بخش حیدری

قریب ۱۷۶۸ء - ۱۸۲۳ء

حیدری فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں سب سے زیادہ کتابوں کے مصنف و مترجم ہیں۔ نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شاعر بھی ہیں لیکن ان کی شہرت کا مدار نثری تصانیف پر ہی ہے۔

ان کا نام حیدر بخش اور تخلص حیدری ہے۔ سید ابوالحسن کے بیٹے تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ حیدر بخش نے ابھی بچپن سے آگے قدم نہیں رکھا تھا کہ ان کے والد کو ایسی معاشی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کہ مجبوراً دہلی کی سکونت ترک کر کے اہل و عیال کے ساتھ بنارس چلے گئے۔ یہاں نواب علی ابراہیم خاں ناظم عدالت تھے۔ وہ اس خاندان کی مدد پر کمربستہ ہوئے۔ انھوں نے

ہی حیدر بخش کی تعلیم کا بندوبست کر دیا۔ بنارس کے مشہور مدرسوں میں انھوں نے مروجہ تعلیم حاصل کی تعلیم سے فارغ ہو کر دفتر عدالت میں برسر کار ہو گئے۔

ملازمت کے ساتھ مطالعے اور تصنیف و تالیف کا شوق بھی جاری رہا۔ حیدری نے قصۂ مہر و ماہ کے نام سے ایک کہانی لکھی اور اٹھارہویں صدی کے آخر میں اسے لے کر کلکتہ چلے گئے۔ وہاں گلکرسٹ کی خدمت میں باریاب ہوئے اور اپنی کتاب پیش کی جسے انھوں نے بہت پسند کیا اور منشی کی حیثیت سے حیدری کو کالج کے ملازمین میں داخل کر لیا۔ وہاں رہ کر انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ آخر کار ملازمت سے سبکدوش ہو کر بنارس واپس چلے گئے۔ وہاں ۱۸۲۳ء میں وفات پائی۔

شاعری کے علاوہ انھوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں سے اہم ہیں۔ قصۂ مہر و ماہ، لیلیٰ مجنوں، ہفت پیکر، تاریخ نادری، گلشن ہند، توتا کہانی، آرایش محفل اور گل مغفرت۔ ان میں سے آخری تین کتابوں نے بہت شہرت پائی۔

توتا کہانی سید محمد قادری کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ سنسکرت کی ایک پرانی کتاب کا مولانا ضیاء الدین بخشی نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ قادری نے اس کا خلاصہ کر دیا۔ اس خلاصے کو حیدری نے اردو کا روپ دے دیا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

آرایش محفل حاتم طائی کے فارسی قصے کا ترجمہ اور خلاصہ ہے۔ ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب روضۃ الشہداء کا ایک ترجمہ تو فضلی نے کربل کتھا کے نام سے کیا تھا۔ دوسرا ترجمہ اور خلاصہ حیدری کی آرایش محفل ہے۔ میر امن کا رجحان بول چال کی زبان اور ہندی کی طرف زیادہ ہے۔ اس کے برعکس حیدری کا جھکاؤ فارسی کی طرف ہے۔

میر شیر علی افسوس

۱۷۴۶ء - ۱۸۰۹ء

فورٹ ولیم کالج کے نامور مصنفوں میں ایک نام میر شیر علی افسوس کا ہے۔ کلکتہ پہنچنے سے پہلے ہی وہ شاعر و مصنف کی حیثیت سے

www.urduchannel.in

کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

میر شیر علی نام افسوس تخلص۔ میر قاسم کے داروغہ توپ خانہ میر مظفر علی خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۷۴۶ء کے قریب پیدا ہوئے۔ قیام لکھنؤ نے شاعری کا شوق پیدا کر دیا۔ افسوس تخلص اختیار کیا اور میر حیدر علی حیران سے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ میر، سودا، میر حسن، مصحفی، انشا اور جرأت جیسے شاعروں کی محفلیں دیکھیں اور بڑے بڑے شاعروں کے ساتھ لکھنؤ کے مشاعروں میں شرکت کی۔

لکھنؤ کے ایک رئیس اور نواب آصف الدولہ کے نائب نواب رضا خاں کے ذریعے کرنل اسکاٹ سے ملاقات ہوئی۔ انھیں افسوس کی علمی صلاحیت کا اندازہ ہوا تو پانچ سو روپیہ زادِ راہ دے کر فورٹ ولیم کالج کلکتہ بھیج دیا۔ وہاں منشیوں میں ملازم ہو گئے۔

افسوس نے گلستانِ سعدی کا ترجمہ باغِ اردو کے نام سے کیا۔ یہ کتاب اس لیے زیادہ مقبول نہیں ہو سکی کہ زیادہ فارسی آمیز ہے۔ ان کی دوسری کتاب خلاصۃ التواریخ ہے جو منشی سجان رائے کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

افسوس نے ۱۸۰۹ء میں وفات پائی۔

میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی دہلی کے رہنے والے تھے اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف میں میر منشی تھے۔ غالباً کالج میں سب سے پہلے انھی کا تقرر ہوا تھا۔ انھوں نے گلکرسٹ کی فرمایش پر اخلاق ہندی لکھی۔ یہ سنسکرت کی اخلاقی کہانیوں کا اردو ترجمہ ہے لیکن براہِ راست سنسکرت سے نہیں بلکہ فارسی ترجمے "مفرح القلوب" سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ حسینی نے اس قصے کو جس پر مثنوی سحر البیان کی بنیاد ہے اردو نثر میں لکھا اور "نثر بے نظیر" نام رکھا۔ حسینی کی تیسری کتاب "تاریخ آسام" ہے۔ یہ بھی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ انھوں نے گلکرسٹ کی قواعد کو بھی مختصر کر کے آسان زبان میں لکھا۔

میر کاظم علی جوان

وفات ۱۸۱۶ء

میر کاظم علی نام، جوان تخلص۔ دلی کے رہنے والے تھے لیکن لکھنؤ میں رہایش اختیار کر لی تھی۔ نواب علی ابراہیم خاں خلیل اپنا تذکرہ مرتب کر رہے تھے تو جوان نے اپنے حالات اور نمونۂ کلام انھیں بھیجا جس سے ان کی شعری صلاحیت کا اندازہ ہوا۔ ۱۸۰۰ء میں کرنل اسکاٹ کی نظرِ انتخاب ان پر پڑی اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف کے لیے ان کا انتخاب کر لیا گیا۔

جوان نے فورٹ ولیم کالج کے لیے کئی اہم کتابوں کا ترجمہ کیا۔ انھوں نے کالی داس کی شکنتلا کا برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا۔ تاریخ فرشتہ متعلقہ خاندان بہمنی کو اردو میں منتقل کیا، کلام پاک کا ترجمہ کیا۔ ان کی ایک کتاب بارہ ماسہ یا دستور ہند ہے۔ اس میں ہندوستان کی فصلوں اور تہواروں کا ذکر ہے۔ جوان نے سنگھاسن بتیسی کے لکھنے میں للو لال جی کی مدد کی۔ نیز کلام سودا کا انتخاب کیا۔

نہال چند لاہوری

نہال چند لاہوری دہلی کے رہنے والے تھے مگر پنجاب میں بس گئے تھے اس لیے لاہوری کہلائے۔ ۱۸۰۲ء میں کلکتہ پہنچے۔ وہاں کپتان ولرٹ تک ان کی رسائی ہو گئی اور ان کی سفارش پر انھیں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں شامل کر لیا گیا۔

ہندوستان کی لوک کتھاؤں میں گل بکاولی کی کہانی بہت مشہور و مقبول تھی۔ عزت اللہ بنگالی نے اسے فارسی میں لکھا تھا۔ نہال چند لاہوری نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل کر دیا اور کتاب کا نام مذہبِ عشق رکھا۔ اسی کہانی کو آگے چل کر پنڈت دیا شنکر نسیم نے مثنوی گلزارِ نسیم کی شکل میں پیش کیا۔ مذہبِ عشق کی زبان بہت سلیس، رواں اور شیریں ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور کئی بار شائع ہوئی۔

مظہر علی خاں ولا

وفات ۱۸۱۶ء

مظہر علی خاں نام۔ ولا تخلص۔ سلیمان علی خاں کے بیٹے تھے۔ تلاشِ معاش میں کلکتہ پہنچے اور فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں شامل

www.urduchannel.in

ہوگئے۔ چار کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ ناصر علی خاں بلگرامی کی کتاب ہفت گلشن کو انھوں نے اردو میں منتقل کیا۔ یہ کتاب پند و نصائح پر مشتمل ہے۔ بیتال پچیسی جو پچیس قصوں پر مشتمل ہے اسے اردو کا جامہ پہنایا۔ تاریخ شیر شاہی کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کتابوں کے علاوہ پند نامۂ سوری کا منظوم ترجمہ کیا۔

مولوی اکرام علی

مولوی اکرام علی بھی فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے عربی کی مشہور کتاب اخوان الصفا کے صرف ایک حصے کا ترجمہ کیا۔ باقی کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر ڈویس نے کیا لیکن زبان ناہموار تھی۔ کپتان ٹیلر کی فرمائش پر مولوی صاحب نے اس پر نظرِ ثانی کی اور زبان کو سنوارا۔

بینی نراین جہاں

بینی نراین نام۔ جہاںؔ تخلص۔ وطن لاہور۔ آخر میں اسلام قبول کرکے مولانا سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ جہاںؔ فورٹ ولیم کالج سے اس وقت وابستہ ہوئے جب گلکرسٹ کالج سے تعلق منقطع کر چکے تھے۔

جہاںؔ کی شہرت "دیوانِ جہاں" کے سبب ہے۔ اس میں سوا سو شاعروں کا مختصر حال درج ہے اور ان کا نمونۂ کلام شامل ہے۔ جہاںؔ نے اپنا بیشتر کلام بھی اس میں شامل کردیا ہے۔ ان کی دوسری کتاب "چار گلشن" ہے۔ جو ایک عشقیہ داستان ہے۔ گارساں دتاسی کا بیان ہے کہ انھوں نے تنبیہ الغافلین کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

للو لال جی

للو لال جی گجرات کے برہمن تھے اور کالج میں ان کا تقرر ہندی میں کتابیں لکھنے کے لیے کیا گیا تھا مگر وہ اردو سے بھی واقف تھے اور میر کاظم علی جوان کی مدد سے انھوں نے سنگھاسن بتیسی لکھی جو اردو اور ہندی دونوں رسم خط میں شائع ہوئی۔

انھوں نے ہندی میں پریم ساگر، راج نیتی اور بعض دوسری کتابیں لکھیں۔ انھوں نے اپنی زبان کی بنیاد کھڑی بولی پر رکھی اور رسم خط وہ اختیار کیا جو دیو ناگری کہلایا۔ یہ رسم خط اور یہ زبان ملک میں بہت جلد مقبول ہوئی۔ دراصل معمولی ردّ و بدل اور رسمِ خط کے اختلاف کے باوجود یہ اردو کی ایک شکل تھی۔

مرزا علی لطف

قریب ۱۷۵۴ء - ۱۸۲۲ء

مرزا علی نام۔ لطفؔ تخلص۔ وطن استرآباد۔ ان کے والد کا نام کاظم علی خاں تھا۔ نادر شاہ کے ساتھ ۱۷۴۱ء میں ہندوستان آئے اور شاہی دربار سے وابستہ ہوگئے۔ اس لیے تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق تھا اس لیے گلکرسٹ کی نظرِ انتخاب ان پر پڑی۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں داخل کیے گئے اور شعرائے اردو کا تذکرہ ترتیب دینے کا کام تفویض ہوا۔ انھوں نے علی ابراہیم خاں کے تذکرہ گلزار ابراہیم کو بنیاد بنایا اور اس میں بہت سے اضافے کیے۔

یہ تذکرہ ایک عرصے تک نایاب رہا۔ جب حیدرآباد میں طوفان آیا تو اس تذکرے کی ایک جلد کہیں سے موسیٰ ندی میں بہتی چلی آئی اور کسی قدرداں کے ہاتھ لگ گئی۔ بعد کو اسے انجمن ترقی اردو نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔

مولوی امانت اللہ شیدا

امانت اللہ نام۔ شیداؔ تخلص۔ ان کے حالات کہیں دستیاب نہیں۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ وطن کہاں تھا۔ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوگئے تھے۔ یہاں انھوں نے ۱۸۰۵ء میں اخلاقِ جلالی کا ترجمہ جامع الاخلاق کے نام سے کیا۔ انھوں نے صرف و نحو کو نظم کا روپ دیا۔

مرزا جان طپش

۱۷۶۸ء - ۱۸۱۶ء

اصل نام مرزا جان تھا، عرفیت مرزا جان۔ اسی سے شہرت پائی۔ طپشؔ تخلص اختیار کیا۔ ولادت ۱۷۶۸ء کے قریب دہلی میں ہوئی۔ عربی کے علاوہ سنسکرت کی استعداد بھی بہم پہنچائی۔ پہلے مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے لیکن اسے مزاج کے خلاف پایا تو فوج سے منسلک ہوگئے۔ جہاں دار شاہ کی موت کے بعد دلّی کی رہائش ترک کردی۔ روزگار کی تلاش میں ڈھاکہ پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد کلکتہ پہنچے اور فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوگئے۔ کتابوں پر نظرِ ثانی کا کام انھیں سونپا گیا۔ انھوں نے بہارِ دانش کے نام سے ایک فارسی قصے کو اردو میں نظم بھی کیا اور

www.urduchannel.in

مصطلحات پر ایک کتاب بھی لکھی۔ بقول اسپرنگر ۱۸۱۶ء میں وفات پائی۔

حمید الدین بہاری حمید الدین کا تعلق صوبۂ بہار سے تھا اس لیے بہاری نام کا حصہ بن گیا۔ کالج قائم ہونے کے چند سال بعد تصنیف و تالیف کے شعبے سے متعلق ہو گئے۔ انھوں نے صرف ایک کتاب لکھی اس کا نام "خوان الوان" ہے۔ اس میں طرح طرح کے کھانے بنانے کی ترکیبیں ہیں۔ یہ کتاب شائع نہیں ہو سکی۔

مرزا محمد فطرت مرزا محمد نام، فطرت تخلص، وطن لکھنؤ۔ انھوں نے جارج ٹائٹلر کی لکھی ہوئی قواعد اردو پر نظر ثانی کی۔ اس کتاب میں ہندوستان کے رہن سہن کے بارے میں مفید معلومات بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ولیم ہنٹر کی مدد سے انجیل کا اردو میں ترجمہ کیا جسے آج بھی مستند مانا جاتا ہے۔ بعد کے مترجمین نے فطرت کے ترجمے سے مسلسل استفادہ کیا ہے۔

⁂

فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین کا مختصر تعارف اوپر پیش کیا گیا لیکن ان کے علاوہ یہاں چند مصنفین اور بھی تھے جنھوں نے کتابیں لکھیں مثلاً خلیل علی اشک، حفیظ الدین، تارنی چرن مترا، امانت علی شیدا وغیرہ۔ کالج کے تصنیفی کارناموں پر مختلف قسم کے اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کتابوں کے انتخاب پر مناسب توجہ نہیں کی گئی اور اعلیٰ درجے کی کتابوں کے بجائے قصے کہانیوں کی کتابوں پر زور رہا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس زمانے میں یہ کتابیں کالج کی چار دیواری کے اندر محدود رہیں۔ کالج کے باہر ان کی اشاعت پر توجہ نہیں دی گئی۔ دراصل یہ کتابیں۔ نو وارد انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے لکھوائی گئی تھیں اور یہ مقصد ان سے حاصل ہوا۔ آگے چل کر یہ سرمایہ بہت بیش قیمت ثابت ہوا اور اسی کی بنیاد پر اردو نثر کی عمارت اٹھی۔

تصنیفی کام فورٹ ولیم کالج سے باہر

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ شروع میں صرف کالج کی چار دیواری میں محدود رہیں اور کالج کی تدریسی ضرورتوں کو پورا کرتی رہیں لیکن کالج سے باہر کی دنیا پر بھی ان کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا۔ اس کے علاوہ حالات کا تقاضا بھی تھا کہ نثر کی کتابیں لکھی جائیں۔ اس لیے کالج سے باہر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ اس وقت تک چھاپہ خانہ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ کوئی کتاب لکھی جاتی تو اسے حاصل کرنے کا صرف ایک طریقہ تھا کہ اس کی نقل کرنی یا کرائی جائے اس لیے بہت سی کتابیں زمانے کے ہاتھوں برباد ہو گئی ہوں گی لیکن جو کتابیں موجود ہیں ان کی تعداد بھی کم نہیں۔ یہاں اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

لکھنؤ میں محمد بخش مہجور نے کئی داستانیں لکھیں۔ ان میں "نورتن" اور "گلشن نوبہار" نے کافی شہرت پائی۔ محمد حسین کلیم جو میر تقی میر کے عزیز قریب تھے انھوں نے تصوف کی ایک اہم کتاب فصوص الحکم کا اردو میں ترجمہ کیا۔ حقیقت کی "جذب عشق" اور تشنہ کی "ہفت سیاح" نے بھی شہرت پائی۔ لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں جو سب سے اہم نثری تصنیف وجود میں آئی وہ انشاء اللہ خاں انشا کی تصنیف "رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی" ہے۔

اس کتاب کی زبان خالص ہندوستانی ہے۔ یعنی اس میں فارسی عربی الفاظ استعمال نہیں کیے گئے۔ زبان بہت سادہ اور رواں ہے۔ انشا کی دوسری اہم نثری تصنیف "دریائے لطافت" ہے۔ اس کی زبان فارسی ہے مگر اس میں جا بجا اردو نثر کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب قواعد کے علاوہ اردو لسانیات کے سلسلے میں ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ انکی ایک اور کتاب "سلک گہر" ہے۔ یہ ایک مختصر کہانی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسے حروف استعمال کیے گئے ہیں جن میں نقطہ نہیں لگتا۔

www.urduchannel.in

ان کے علاوہ بہت سی ایسی کتابیں لکھی گئیں جو شہرت نہیں پا سکیں مثلاً مولوی کریم الدین کا ترجمہ تاریخ "ابی الفدا" (عربی سے)، مولوی محمد صفا کی "زادِ آخرت" حافظ علی کی "راہِ نجات"، مولوی محمد حیات کی "سراج الحیات"، مولوی عبدالقادر کی "گلشنِ دین"۔

اس باب میں بعض یورپی مصنفین کی کتابوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ کپتان جوزف ٹیلر نے ولیم ہنٹر کے اشتراک سے انگریزی اردو لغت مرتب کی جو ۱۸۰۸ء میں شائع ہوئی۔ گلیڈون کی ایک لغت ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ جان شیکسپیر کی اردو لغت ۱۸۱۳ء میں شائع ہوئی۔ بڑمین نے ہندوستان کی قواعد لکھی جو ۱۸۳۱ء میں شائع ہوئی۔

مذہب کی اشاعت کے سلسلے میں جو تصنیفی کام کیے گئے ان سے بھی اردو نثر کو فائدہ پہنچا۔ انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دین اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں لکھی گئیں کتابیں اور عیسائی مبلغین کے تصنیفی کام۔ انیسویں صدی کے آغاز میں وہابی تحریک کو فروغ ہوا۔ اس تحریک کے رہنما مولوی اسماعیل تھے۔ انھوں نے سکھوں کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کیا۔ تحریک کو عام کرنے کے لیے انھوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں "تقویت الایمان" بہت مشہور ہوئی۔

سیرام پور بنگال کے عیسائی مبلغوں نے مختلف زبانوں میں انجیل کے ترجمے کرائے۔ سب سے زیادہ ترجمے اردو میں ہوئے کیوں کہ یہی اس زمانے کی مقبول زبان تھی۔

دلّی کالج

اس باب میں دلّی کالج کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ فورٹ ولیم کالج پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہاں قصے کہانیاں تو لکھی گئیں لیکن علوم کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ یہ کمی بالآخر دلّی کالج میں پوری ہوئی۔ ۱۸۲۵ء میں دلّی میں ایک مدرسہ قائم ہوا۔ اس کا مقصد جدید علوم کو عام کرنا تھا۔ انگریزی زبان کی تعلیم کو اس مدرسے میں بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ شروع میں اس کی شدید مخالفت کی گئی لیکن ۱۸۳۱ء میں انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد تین سو ہو گئی اور اے کالج کا درجہ حاصل ہو گیا۔ کالج میں ریاضی، ہیئت، جغرافیہ اور سائنس کی تعلیم اردو زبان کے ذریعے دی جاتی تھی۔ یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا۔

تعلیم کو فروغ دینے کی غرض سے کالج میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ ہونہار طلبا کے لیے وظائف بھی مقرر تھے۔ کالج کے طلبا کے لیے اس وقت تک اعلیٰ درجے کی کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں۔ یہ کمی لکچروں سے پوری کی جاتی تھی اور طلبا لکچرز کے نوٹ لے لیتے تھے۔ سائنس کا ذوق عام کرنے کے لیے طلبا کے روبرو تجربات کیے جاتے تھے اور طلبا ان میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔

ورناکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی

کالج کے قیام کے ساتھ ہی اس ضرورت کا احساس عام ہوا کہ اعلیٰ درجے کی علمی کتابوں کا اردو میں منتقل کیا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ تصنیف و تالیف کے کام کے لیے ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل دلّی کالج کی نگرانی میں ایک سوسائٹی قائم کی گئی جو ۱۸۵۷ء تک قائم رہی۔ اس نے زبان و ادب کی بیش قیمت خدمت انجام دی۔ ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی اس سوسائٹی سے متعلق تھے۔ ان کی نگرانی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ بہت سی فارسی اور انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کرایا گیا۔ جو کتابیں اس سوسائٹی کے زیر اہتمام تیار کرائی گئیں وہ سب سادہ اور سہل زبان میں تھیں۔ ان سے آسان اور سادہ زبان لکھنے کے رواج کو تقویت ملی۔

اس سوسائٹی کے تحت رامائن، مہابھارت، دھرم شاستر، لیلاوتی، شکنتلا، رگھوونش وغیرہ اہم کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ سودا، میر، درد، جرأت وغیرہ کے دیوان شائع کیے گئے۔ انگلستان، یونان، روم، ایران جیسے ملکوں کی تاریخ و جغرافیہ سے شناسائی کا بندوبست کیا گیا اور سائنس کے مختلف شعبوں پر کتابیں لکھوائی گئیں۔ فارسی اور انگریزی کے علاوہ عربی اور سنسکرت کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔

کتابوں کی تیاری میں سب سے زیادہ دخل رام چندر کی کوششوں کو ہے۔ ریاضی سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ جدید تعلیم اور سائنسی خیالات کی اشاعت ان کی زندگی کا اہم مقصد تھا۔

www.urduchannel.in

اردو سرکاری زبان

انیسویں صدی کے آغاز تک سرکاری زبان فارسی تھی لیکن ملک میں اردو زبان ہر طرف عام ہو گئی تھی۔ اردو بول چال کی زبان تو ایک عرصے سے تھی لیکن اب یہی زبان لکھنے پڑھنے کے کام آتی تھی۔ اس کی مقبولیت اور ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے ۱۸۳۲ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ اس قدم سے اردو کی ترقی کی راہیں کھل گئیں اور ہر طرف اسی کا چلن ہو گیا۔

---

(۳)

اردو نثر ترقی کی شاہراہ پر

انیسویں صدی کا آغاز ہوا تو اردو زبان ملک کے طول و عرض پر چھا چکی تھی اور شاہی کے بعد نثر میں بھی ایک وافر ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا۔ یہ ذخیرہ اب محض داستانوں اور قصوں تک محدود نہ تھا بلکہ بہت سی علمی کتابیں بھی لکھی جا چکی تھیں۔ تاریخ، جغرافیہ، سیرت، سوانح، موسیقی، طبیعیات، علم الحرب، ریاضی، صنعت و حرفت، زراعت سبھی مضامین پر کچھ نہ کچھ لکھا جا چکا تھا۔ چھاپہ خانہ ایجاد ہو چکا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابیں لوہے کے حروف میں چھپتی تھیں۔ اب طباعت کے میدان میں ایک قدم اور اٹھ چکا تھا یعنی لیتھو کی چھپائی وجود میں آ گئی تھی اور اسے اردو کے لیے لوہے کے حروف سے بہتر پایا گیا تھا۔ ۱۸۳۰ء میں کانپور میں لیتھو پریس قائم ہوا۔ تجربہ کامیاب رہا تو ۱۸۳۷ء میں ایسا ہی ایک چھاپہ خانہ دہلی میں کھل گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد لکھنؤ میں بھی پریس لگ گیا۔ طباعت کی سہولت فراہم ہو گئی تو اردو میں اخبار بھی نکلنے لگے جس سے ملک میں علمی بیداری پیدا ہوئی۔ چنانچہ انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی گزرنے کے بعد مطالعے کا ذوق بھی عام ہوا اور تصنیف و تالیف کا شوق بھی۔ اس زمانے میں جن اہل قلم نے اپنا سکہ جمایا ان کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

فقیر محمد خاں گویا

فقیر محمد خاں نام، گویا تخلص۔ شاہی فوج میں رسالدار تھے۔ حسام الدولہ، خان بہادر اور تہور جنگ کے خطابات سے

قریب ۱۸۰۵ء - ۱۸۴۹ء

www.urduchannel.in

سرفراز تھے۔ ادبی ماحول نے شعروادب کی طرف متوجہ کیا۔ خود بھی شعر کہنے لگے اور ناسخ کی شاگردی اختیار کی۔ دیوان مرنے کے بعد شائع ہوا۔ لیکن ان کا نام شاعری کے سبب نہیں بلکہ فارسی کتاب "انوارِ سہیلی" کے اس آزاد ترجمے کی وجہ سے زندہ ہے جو انھوں نے بستانِ حکمت کے نام سے کیا۔

گریا نے دیباچے میں دعوا کیا ہے اور دونوں کتابوں کا مقابلہ کرنے سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ دونوں کتابیں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ مترجم نے جا بجا عبارت میں کمی بیشی کی ہے اور اس معاملے میں ذوقِ سلیم کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں غیر ضروری طوالت نظر آئی وہاں اختصار سے کام لیا اور جہاں کوئی دلچسپ مضمون تشنہ نظر آیا وہاں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔ یہ کتاب ۱۸۲۵ء میں مکمل ہوئی۔ ۱۸۵۰ء میں گریا نے وفات پائی۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

۱۷۸۶ء - ۱۸۶۹ء

رجب علی بیگ نام، سرور تخلص، وطن لکھنؤ، سالِ ولادت ۱۷۸۶ء۔ والد کا نام مرزا اصغر علی تھا۔ تربیت اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ عربی فارسی زبان و ادب کے علاوہ شہسواری، تیراندازی، خوشنویسی اور موسیقی میں دستگاہ رکھتے تھے۔ مزاج میں شوخی و ظرافت تھی، نہایت ملنسار اور یار باش آدمی تھے۔ دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ غالب سے بھی دوستانہ مراسم تھے۔

سرور کے ساتھ ۱۸۲۴ء میں یہ حادثہ پیش آیا کہ والیِ اودھ غازی الدین حیدر نے کسی بات پر خفا ہو کر لکھنؤ سے جلاوطن کر دیا۔ سرور اور اردو نثر دونوں ہی کے حق میں یہ جلاوطنی مفید ہوئی کیوں کہ سرور کانپور چلے گئے اور وہاں حکیم اسد علی کی فرمایش پر فسانۂ عجائب لکھی جس کے سبب اردو ادب میں سرور کو حیاتِ جاوید حاصل ہوئی۔ نصیر الدین حیدر تخت نشیں ہوئے تو انھوں نے سرور کا قصور معاف کر کے انھیں لکھنؤ آنے کی اجازت دے دی۔ واجد علی شاہ کا دور شروع ہوا تو انھوں نے پچاس روپے ماہانہ پر درباری شعرا میں داخل کر لیا۔

۱۸۵۶ء میں سلطنتِ اودھ کا خاتمہ ہو گیا اور تنخواہ بند ہو گئی تو سرور پھر مالی دشواریوں میں مبتلا ہو گئے۔ سید امداد علی اور منشی شیو پرشاد نے کچھ دنوں مدد کی لیکن ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ صاحب کمال تھے۔ اس لیے مہاراجا بنارس، مہاراجا الور اور مہاراجا پٹیالہ کے درباروں سے وابستہ ہو کر کچھ دن عزت کے ساتھ گزارے۔ اخیر عمر میں آنکھوں کے علاج کے لیے کلکتہ گئے۔ وہاں سے واپسی پر بنارس میں ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

سرور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فسانۂ عجائب ان میں سب سے پہلی اور سب سے اہم ہے۔ ۱۸۲۴ء اس کا زمانۂ تصنیف ہے۔ یہ حسن و عشق کا افسانہ ہے۔ انداز داستان کا ہے۔ اس میں غیر فطری باتیں بھی بہت سی ہیں۔ اسی لیے بعض اہلِ نظر نے اسے داستان اور ناول کے بیچ کی کڑی کہا ہے۔ فسانۂ عجائب کی عبارت انتہائی پرتکلف، نہایت پیچیدہ اور مقفیٰ مسجع ہے۔ رنگینیِ بیان سے کتاب کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کو میر امن کی باغ و بہار کی ضد سمجھنا چاہیے۔ مصنف نے باغ و بہار اور اس کے مصنف کا مذاق اڑایا ہے۔ سادہ و سہل زبان ان کے نزدیک کوئی خوبی نہیں، عیب ہے۔ رنگینی، صنائع اور عبارت آرائی کو ہی وہ سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اس زمانے میں اس اندازِ نگارش کی قدر بھی بہت تھی۔ اس لیے یہ بہت مقبول ہوئی اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔ اب زمانے کا ورق الٹ چکا اور اسے عیب سمجھا جانے لگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مصنوعی عبارت کا دل پر اثر نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ وزن کی فکر کرنے، قافیہ ڈھونڈنے، تشبیہ و استعارے سے عبارت کو رنگین بنانے کی کوشش میں ہی مصنف کی ساری صلاحیت صرف ہو جاتی ہے اور جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے کہہ نہیں پاتا۔

سرور کی اور بہت سی کتابیں ہیں مثلاً سرور سلطانی، شرر عشق، شگوفۂ محبت، گلزارِ سرور، شبستانِ سرور اور انشاے سرور۔ سرور سلطانی شاہنامۂ فردوسی کے ایک فارسی خلاصے کا ترجمہ ہے اور ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ کی فرمایش پر لکھی گئی۔ شرر عشق چڑیوں کی دلچسپ داستانِ محبت

www.urduchannel.in

ہے جو ۱۸۵۶ء میں لکھی گئی۔ شگوفۂ محبت بھی محبت کی کہانی ہے۔ گلزارِ سرور کا موضوع اخلاق تصوف ہے۔ غالب نے اس پر تقریظ لکھی ہے۔ شبستانِ محبت الف لیلہ کی کچھ کہانیوں کا ترجمہ ہے۔ انشائے سرور مصنف کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

مرزا غالب

مرزا غالب جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے اردو میں چند کتابوں پر تقریظیں اور دو ایک چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں۔ لیکن ان کی زبان فسانۂ عجائب کی زبان کی طرح مصنوعی اور پیچیدہ ہے اس لیے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں لیکن انھوں نے اردو میں جو خطوط لکھے ان سے اردو نثر کی ترقی میں بہت مدد ملی۔

غالب کے زمانے میں فارسی میں خط لکھنے کا رواج تھا۔ خود غالب پہلے فارسی میں خط لکھا کرتے تھے لیکن ایک زمانے میں مصروفیت اور خرابی صحت کے سبب وہ اردو میں خط و کتابت کرنے لگے اور وہ بھی قلم برداشتہ۔ مطلب یہ کہ قلم اٹھایا اور بغیر کسی تیاری کے جو کچھ سمجھ میں آیا لکھ دیا یہ بے تکلف انداز اتنا پسند کیا گیا کہ انھوں نے مکتوب نویسی کے لیے فارسی کی جگہ اردو کو اپنا لیا۔ خط و کتابت کا انھیں بہت شوق تھا۔ خود ان کا بیان ہے کہ دن کا زیادہ حصہ خط پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا تھا۔ کوئی جواب نہ دے یا جواب میں دیر کرے تو انھیں بہت ناگوار گزرتا تھا۔

خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔ غالب نے اسے پوری ملاقات بنا دیا۔ معلوم ہوتا ہے خط نہیں لکھ رہے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک جگہ بڑے فخر کے ساتھ لکھتے ہیں:

"میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ سو کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

ان کا مزاج نرالا تھا۔ کسی کی پیروی کو باعثِ شرم خیال کرتے تھے۔ ہر معاملے میں اپنا راستہ آپ نکالتے تھے اور وہ بھی سب سے الگ۔ اس زمانے میں مکتوب نگاری کا جو انداز تھا (اور

وہ بھی فارسی میں) غالب نے اسے رد کر کے نیا انداز ایجاد کیا۔ مثلاً اس دور میں لمبے لمبے القاب و آداب کا رواج تھا۔ انھوں نے مختصر سے مختصر القاب لکھے جیسے بھائی صاحب، مہاراج، میری جان، بندہ پرور۔ کہیں مکتوب الیہ یعنی جس کو خط لکھ رہے ہیں اس کا نام لیا اور بات شروع کر دی۔ دیکھیے:

"یوسف مرزا، تجھ کو کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔"

"میاں لڑکے، کہاں پھر رہے ہو۔ آؤ بیٹھو۔"

"ارے کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو، لو صاحب وہ آئے۔ (کیسا ڈرامائی انداز ہے۔ نہ وہ آئے۔ نہ انھیں بلایا۔ بس یہ ساری باتیں فرض کر لیں۔)

کبھی یہ بھی کرتے ہیں کہ سرے سے القاب نہیں لکھتے، خط شروع کر دیتے ہیں۔ بلکہ ایک دو جگہ تو یہ بھی کیا کہ آخر میں اپنا نام بھی نہیں لکھا۔ صرف یہ لکھ دیا کہ "ہم اپنا نام نہیں لکھتے۔ دیکھیں تم پہچان جاتے ہو کہ نہیں۔"

آج تک دستور ہے کہ کسی کو سلام دعا پہنچانا ہو تو خط کے آخر میں لکھتے ہیں۔ غالب نے یہ قید بھی اٹھا دی۔ ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے کہ "سب سے پہلے میر سرفراز حسین کو میرا سلام پہنچے۔" یہی معاملہ تاریخ کا ہے۔ خط لکھنے کی تاریخ کبھی شروع میں لکھتے ہیں کبھی آخر میں اور کبھی درمیان میں۔

خطوطِ غالب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے خاندان کے، اپنے آبا و اجداد کے اور خود اپنے مکمل حالات بیان کر دیے ہیں۔ حد یہ ہے کہ غالب نے ان باتوں کو بھی نہیں چھپایا جنھیں اکثر لوگ چھپا جاتے ہیں۔ مثلاً ان خطوں میں غالب کی شراب نوشی کا ذکر موجود ہے، ایک ڈومنی انھیں چاہتی تھی یہ بات بھی صاف صاف بتا دی۔ اپنی تنگ دستی اور مہاجن سے قرض لینے کا حال بے کم و کاست لکھ دیا۔ یہ خط غالب کی مکمل سوانح عمری ہیں۔

غالب کے زمانے کی دلی کو دیکھنا ہو تو غالب کے خطوط کی ورق گردانی کیجیے۔ غدر

www.urduchannel.in

کے حالات، دلی کا اجڑنا، بے گناہوں کا مرنا یا ان کی سزا پانا سبھی کچھ ان میں موجود ہے۔

غالب نہایت شگفتہ مزاج تھے۔ شوخی اور ظرافت طبیعت میں داخل تھی جبھی تو حالی نے انھیں حیوانِ ظریف کہا ہے۔ یہ خطوط لطیفوں، چٹکلوں اور دلچسپ باتوں سے بھرے پڑے ہیں۔

یہ سمجھنا غلط ہے کہ غالب نے ان خطوں میں صرف بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ علمی معاملات کے سلسلے میں انھوں نے علمی زبان کا استعمال کیا ہے۔ اردو میں استدلالی نثر سرسید کا کارنامہ خیال کیا جاتا ہے لیکن خطوط غالب میں استدلالی نثر کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔

(غالب کے حالاتِ زندگی کے لیے شاعری کا حصہ ملاحظہ فرمائیں۔)

غلام امام شہید

۱۸۰۴ء - ۱۸۷۶ء

غلام امام نام، شہید تخلص، وطن امیٹھی ضلع لکھنؤ۔ علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ نظم و نثر پر قدرت حاصل کی۔ شعر کہنے لگے تو قتیل، پھر مصحفی سے اصلاح لی۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور آغا سید اسمٰعیل مازندرانی سے اصلاح لیتے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں الہ آباد میں قیام تھا لیکن نثر و نظم کی شہرت دور تک پہنچی تھی۔ چنانچہ نظام حیدر آباد کی سرکار سے وظیفہ مقرر تھا جو مرتے دم تک جاری رہا۔ رام پور کے نواب کلب علی خاں شہید کی قدر کرتے تھے۔

شہید نے جو کچھ لکھا اسے محفوظ کر لینے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ نثر و نظم کا بہت سا حصہ زمانے کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ چند قصائد باقی رہ گئے اور ایک مجموعہ مولود شریف" شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ" انشائے بہارِ بے خزاں" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

شہید کی نثر میں قدامت کا انداز جھلکتا ہے۔ عبارت آرائی اور رنگینی بیان کی طرف طبیعت مائل نظر آتی ہے۔ قافیہ پیمائی کا بھی شوق ہے۔ اس کے باوجود وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر سلاست و روانی کو اپنایا مگر نثر نگاری میں کوئی انقلابی قدم نہ اٹھا سکے۔

غلام غوث بیخبر

۱۸۲۴ء - ۱۹۰۵ء

خواجہ غلام غوث نام، بے خبر تخلص۔ بزرگوں کا وطن کشمیر تھا لیکن ان کے والد خواجہ حضور اللہ کشمیر کی سکونت ترک کر کے تبت چلے

گئے تھے۔ وہاں بھی مستقل طور پر قیام نہیں کیا۔ وہاں سے نیپال چلے آئے اور یہیں بود و باش اختیار کر لی۔ یہیں ۱۸۲۴ء میں غلام غوث کی ولادت ہوئی۔ ابھی صرف چار برس کی عمر تھی کہ ان کے والد نے بنارس منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اسی شہر میں غلام غوث کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان کے خالو لفٹیننٹ گورنر کے میر منشی تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ان کی ماتحتی میں ملازم ہو گئے۔ نہایت تندہی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ ۱۸۸۵ء پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں الہ آباد میں وفات پائی۔

بے خبر اپنے زمانے کے نامور نثر نگار تھے۔ عمر میں غالب سے چھوٹے تھے لیکن علمی لیاقت اور تصنیفی صلاحیت کے ساتھ غالب ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ظاہر ہے غالب کے اندازِ تحریر سے ضرور واقف ہوں گے مگر دل ادھر مائل نہ ہو سکا۔ جس طرح کی رنگین اور پر تصنع عبارت کا اس زمانے میں چلن تھا اسی کو اپنایا۔ مقفیٰ مسجع عبارت سے البتہ دامن بچاتے ہیں مگر رعایت لفظی اور مبالغے کو پسند کرتے ہیں اور ان دونوں صنعتوں کا اپنی نثر میں خوب استعمال کرتے ہیں۔ استعارہ و تشبیہہ سے بھی بہت کام لیتے ہیں۔ اس پر حیرت ہوتی ہے کہ فارسی عربی الفاظ کا استعمال ان کے یہاں کم ہے۔ غلام امام شہید کے داماد تھے۔ ان کی نثر کا کافی اثر قبول کیا ہے۔

خونابۂ جگر، رشکِ لعل و گہر اور فغانِ بے خبران کی تصانیف ہیں۔ فغانِ بے خبر خطوط اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ خطوط کا ایک مختصر مجموعہ "انشائے بے خبر" کے نام سے بھی شائع ہوا۔

---

www.urduchannel.in

۴

اردو نثر کا عہدِ زرّیں

۱۸۵۷ء کا سال ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال ہندوستان سے مغل سلطنت کا مکمل طور پر خاتمہ ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ایک تہذیب بھی مٹ گئی۔ ملک پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا۔ ان کے ساتھ ایک نئی تہذیب آئی، سوچنے کا نیا انداز آیا۔ ہمارے بزرگ نقادوں نے انگریزی ادب کو دیکھا تو اس کے مقابلے میں اپنا ادب ناکارہ اور بے مصرف نظر آیا۔ شاعری میں عشق و عاشقی کے قصے بے وقت کی راگنی محسوس ہوئے۔ نثر کا مصنوعی انداز اظہارِ خیال کے راستے کی رکاوٹ معلوم ہوا۔ اہلِ قلم کے دلوں میں یہ احساس جاگزیں ہوگیا کہ اب اپنی نثر و نظم کی دنیا بدل ڈالنے کا وقت آگیا ہے۔ اردو ادب کی خوش قسمتی کہ کئی دیو قامت نثر نگار پیدا ہوگئے جن کی تحریروں نے اردو نثر کی کائنات میں ایک عظیم انقلاب پیدا کردیا۔ اس باب میں ان بلند پایہ نثر نگاروں کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

سرسید احمد خاں

۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء

سرسید احمد خاں انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے رہنما ہوئے ہیں۔ ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ان کی کوشش سے ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ قوم جو سستی کاہلی اور بے عملی کی بیماری میں مبتلا ہو کر تباہی کے گڑھے میں جاگری تھی، سرسید کے جگانے سے جاگی، ہوش میں آئی، جہد و عمل پر کمربستہ ہوئی اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوگئی۔

انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر توجہ کی اور جہاں جہاں خرابی نظر آئی اسے دور کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کے طور طریقوں اور رہن سہن میں انھیں بہت خرابیاں نظر آئیں۔ انھیں دور کرنے کے لیے بہت سے مضمون لکھے۔ گفتگو کرنے کا انداز کیا ہونا چاہیے، کھانے کے آداب کیا ہیں، اٹھنے بیٹھنے کے پسندیدہ طریقے کیا ہیں، ان سب پر روشنی ڈالی۔ انگریز دشمنی سے بچنے اور کچھ دنوں کے لیے سیاست سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ مسلمانوں کو مذہب کی اصل روح سے روشناس کیا لیکن یہاں خاص طور پر یہ دیکھنا ہے کہ اردو نثر پر انھوں نے کیا احسان کیا۔

بہت غور و فکر کے بعد سرسید نے اردو شعر و ادب کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ انھوں نے واضح کردیا کہ شعر و ادب نہ تو بیکاروں کا مشغلہ ہے نہ تفریح و دل لگی کا ذریعہ بلکہ یہ زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا آلہ ہے۔ مراد یہ کہ انھوں نے ادب کی افادیت اور مقصدیت پر زور دیا۔ اردو نثر کے عیب انھوں نے گن گن کر بتائے۔ مبالغہ آرائی، لفاظی، تصنع اور قافیہ پیمائی اردو نثر کے وہ عیب تھے جن سے سرسید کو نفرت تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ اردو نثر میں وہ صلاحیت پیدا ہوجائے کہ کام کی بات سیدھے سادے لفظوں میں ادا کی جاسکے تاکہ بات مصنف کے دل سے نکلے اور قاری کے دل میں بیٹھ جائے۔ وہ خود نثر نگار تھے۔ انھوں نے ایسا کرکے دکھا دیا۔ ان کی رہنمائی اور تربیت سے بہت سے ایسے ادیب پیدا ہوگئے جو سرسید کی طرح وضاحت، صراحت اور قطعیت کے ساتھ اظہارِ خیال پر قدرت رکھتے تھے۔

آئیے اب سرسید کی زندگی کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے سرسید کو اردو نثر کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔

۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو سرسید دہلی کے ایک علم دوست اور آسودہ حال گھرانے میں پیدا

www.urduchannel.in

ہوئے۔ ان کے بزرگ شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور مغل سلطنت میں اعلیٰ عہدوں سے سرفراز ہوئے۔ ان کے نانا کا اپنے زمانے کے عالموں میں شمار تھا، ریاضی اور نجوم میں مہارت رکھتے تھے۔ انگریز افسروں سے ان کے خصوصی مراسم تھے۔ سرسید کے والد سے آخری مغل بادشاہ کے ایسے تعلقات تھے کہ وہ انھیں بھائی متقی کہہ کے مخاطب کرتا تھا۔ خود سید احمد کی قلعے میں آمد و رفت تھی جس کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کے کس بل کا انھیں بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔

سید احمد کی تربیت میں ان کی والدہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ ایک نیک اور رحم دل خاتون تھیں۔ اس وقت دہلی میں بڑے بڑے عالم موجود تھے جن سے سرسید نے علم حاصل کیا۔ شاعروں کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ اکیس بائیس برس کی عمر میں انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت قبول کر لی اور سررشتہ داری سے شروعات کر کے صدر امین کے عہدے تک پہنچے۔ اسی ملازمت کے دوران انھوں نے اپنی اہم کتاب آثار الصنادید لکھی جس میں دہلی کی تاریخی عمارتوں اور نامور لوگوں کے حالات بہت چھان بین کے بعد لکھے گئے ہیں۔

ملازمت کے سلسلے میں بجنور میں ان کا قیام تھا جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت بپا ہوئی۔ ان کی مستحکم رائے تھی کہ مسلمانوں کو اس سے دور رہنا چاہیے اور انھیں یقین تھا کہ یہ بغاوت ضرور ناکام ہوگی۔ انھوں نے سارا ہنگامہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور انگریزوں کی حمایت کی۔ "تاریخ سرکشی بجنور" میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ پھر "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر انھوں نے یہ واضح کیا کہ سرکار کی غلط پالیسی ہی اس بغاوت کی ذمہ دار تھی۔ بعد کو "لائل محمڈنز آف انڈیا" میں انھوں نے وضاحت کی کہ مسلمان سرکار انگریزی کے بدخواہ نہیں۔ اس کے بعد صدر امین بنا کر انھیں مرادآباد بھیج دیا گیا۔ یہاں آ کر انھیں یہ اندازہ لگانے کا موقع ملا کہ ہندوستان کے مسلمان اس بغاوت کی پاداش میں کس بری طرح برباد کر دیے گئے ہیں۔ سرسید نے حتی الامکان مسلمانوں کو سزاؤں سے بچانے کی کوشش کی۔ مرادآباد میں انھوں نے ہندو اور مسلمان سب کے لیے ایک یتیم خانہ اور ایک شفاخانہ

قائم کیا۔

سرسید کا تبادلہ غازی پور کو ہو گیا تو ان کے تعمیری پروگرام زیادہ سرگرمی سے جاری ہو گئے۔ انھوں نے سائنٹی فک سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی میں بہت سی اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا گیا اور سائنس پر لکچر دلائے گئے۔ اسی زمانے میں اسی سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک اخبار سائنٹی فک گزٹ جاری کیا گیا۔

ایک انگریز ولیم میور نے "لائف آف محمد" لکھی اور سیرت پاک کے خلاف زہر افشانی کی۔ سرسید نے یہ کتاب دیکھی تو مضطرب ہو گئے۔ تمام اثاثہ فروخت کر کے اور دوستوں سے قرض لے کر انگلستان گئے اور اس کا دنداں شکن جواب لکھا جو بعد کو اردو میں "خطبات احمدیہ" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کتاب استدلالی یعنی مدلل انداز بیان کا بہترین نمونہ ہے۔

انگلستان میں ہی انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان واپس آ کر "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ جاری کریں گے یہ اصلاحی رسالہ جاری ہوا اور اس نے مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اردو نثر کو اس سے خاص طور پر فائدہ پہنچا۔ اس نے قلم برداشتہ اور سلیس و رواں اردو کو ملک میں رواج دیا۔

سرسید کے انگلستان جانے کا ایک مقصد وہاں کے تعلیمی اداروں کا مطالعہ کرنا اور ہندوستان میں اسی طرز کا ایک کالج قائم کرنا بھی تھا۔ چنانچہ واپس آنے کے بعد انھوں نے علی گڑھ میں ایک کالج "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کے نام سے قائم کیا۔ اس وقت سرسید بنارس میں تعینات تھے۔ ان کے مخلص دوستوں نے اس کالج کے قیام میں مدد دی اور یہ ترقی کر کے اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ انھوں نے ایک اور اہم تعلیمی ادارہ قائم کیا جس کا نام آخر کار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قرار پایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سارے ملک میں جا بجا تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔

مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اردو نثر میں نئی جان ڈالنے والا یہ محسن ۱۸۹۸ء میں ابدی

www.urduchannel.in

نیند سو گیا۔

ہماری شاعری اور ہماری نثر پر سرسید کا احسان ہے کہ ان کی توجہ اور کوشش سے دونوں نے نئی زندگی پائی اور نئی منزلوں کی طرف قدم اٹھایا۔ وہ شاعر نہیں تھے اس لیے بطور خود شاعری کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ ان کی یہ خواہش رہی کہ کوئی شاعر شاعری سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لے۔ حالی نے سرسید کی فرمایش پر مسدس مدوجزر اسلام لکھ کر یہ خدمت انجام دی۔ آگے چل کر اقبال نے اپنی شاعری سے یہ کام لیا۔ نثر نگار سرسید خود تھے اس لیے نثر کی دنیا میں انھوں نے خود اپنی تحریروں سے انقلاب پیدا کر دیا۔ انھوں نے مدعا نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اپنی بات کو دلیلوں کے ساتھ پیش کرنے کا راستہ دکھایا۔ گویا استدلالی نثر کی مثال قائم کی۔ نثر میں وضاحت، صراحت اور قطعیت کی اہمیت واضح کی۔ اردو نثر کو تصنع، فضول عبارت آرائی، لفاظی اور مبالغہ آرائی سے نجات دلائی۔ انھوں نے خود بہت کچھ لکھا اور لکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت تیار کر دی۔ اردو نثر ان کے احسان سے گرانبار ہے۔

محسن الملک

۱۸۱۷ء - ۱۹۰۷ء

سید مہدی علی نام تھا۔ محسن الملک کا خطاب پایا تو لوگ نام بھول گئے محسن الملک ہی کہنے لگے۔ اٹاوہ میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی تعلیم حاصل کر کے دس روپے ماہانہ پر کلکٹری میں ملازم ہو گئے۔ محنت اور دیانت سے کام کرنے کے صلے میں ترقی پاتے رہے۔ یہاں تک کہ تحصیلدار ہو گئے۔ ملازمت کے دوران قانون سے متعلق دو کتابیں لکھیں جنھیں انگریز حکام نے مفید قرار دیا اور وہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیے گئے۔ کارکردگی کی شہرت حیدرآباد تک پہنچی اور انھیں بارہ سو روپے ماہانہ پر مالیات کا انسپکٹر جنرل بنا کر بلا لیا گیا۔ ترقی کا سلسلہ جاری رہا اور وہ مالیات کے معتمد اعلیٰ مقرر ہوئے۔ تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ حسن خدمات کے اعتراف میں ریاست کی طرف سے محسن الدولہ، محسن الملک، منیر نواز جنگ کے خطابات عطا ہوئے۔ حیدرآباد میں ان کی ایسی عزت تھی کہ بے تاج بادشاہ کہلاتے تھے۔ ۱۸۹۳ء میں

پنشن لے کر علی گڑھ چلے آئے اور باقی زندگی کالج کی خدمت میں گزار دی۔ سرسید کے بعد محسن الملک ہی ان کے جانشین ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں شملہ میں انتقال ہوا مگر انھیں علی گڑھ لاکر سرسید کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

محسن الملک کو سرسید کا دست راست کہا جائے تو درست ہے۔ انھوں نے ہر قدم پر سرسید کے ساتھ تعاون کیا۔ اپنی زبان اور اپنے قلم سے سرسید کے افکار و خیالات کو پھیلانے میں مدد کی۔ ان کے مضامین تہذیب الاخلاق میں اکثر شائع ہوتے تھے محسن الملک کی نثر بہت دلکش ہے معلوم ہوتا ہے ایک ایک لفظ پر ان کی نظر رہتی ہے اور وہ بہت سوچ سمجھ کر ان کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس لیے وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا جاتا ہے اور دل پر اثر کرتا ہے۔ ان کے خطوط جو مجموعے کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں آج بھی بہت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ علامہ شبلی بھی محسن الملک کی دلکش تحریر پر فریفتہ تھے۔

چراغ علی

۱۸۴۶ء - ۱۸۹۵ء

چراغ علی کا آبائی وطن کشمیر تھا لیکن ان کے دادا ملازمت کے سلسلے میں پنجاب چلے آئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہیں ۱۸۴۶ء میں چراغ علی کی ولادت ہوئی۔ صرف دس برس کے تھے کہ یتیم ہو گئے۔ والدہ نے پرورش کی مگر تعلیم خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ اردو فارسی کے علاوہ انگریزی بھی سیکھی مگر واجبی سی۔ مالی حالت اچھی نہیں تھی اس لیے فکر معاش دامن گیر ہوئی۔ آخر ضلع بستی پہنچ کر بیس روپے ماہوار پر سرکاری ملازمت کر لی۔ علم کی پیاس بے حساب تھی۔ مطالعے کا شغل جاری رہا یہاں تک کہ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی، لاطینی اور یونانی زبانوں میں مہارت حاصل کر لی۔

علمیت اور لیاقت کی شہرت حیدرآباد تک پہنچی تو مددگار معتمد مالگذاری بنا کر بلا لیے گئے۔ ترقی کر کے معتمد کے عہدے تک پہنچے۔ وہاں کی مصروف زندگی میں بھی مطالعے کے شغل میں کمی نہیں آئی۔ مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھیں جن کی افادیت کو سب نے تسلیم کیا۔ تہذیب الاخلاق میں بھی برابر مضمون لکھتے رہے۔

www.urduchannel.in

مذہب ان کا خاص موضوع تھا اور اس معاملے میں وہ سرسید کے ہم خیال تھے۔ اس لیے ان کی رائے سے اختلاف کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

چراغ علی کا ذہن تحقیقی تھا اس لیے جو کچھ لکھتے بہت چھان بین اور غور و فکر کے بعد۔ اس لیے ان کی تحریروں کا انداز استدلالی ہے مگر وہ دلکشی اور ادبی شان سے بڑی حد تک محروم ہیں۔

چراغ علی ۱۸۹۵ء میں بمبئی میں فوت ہوئے۔

محمد حسین آزاد

۱۸۳۰ء - ۱۹۱۰ء

پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ "اردو نثر کو پر و بال عطا کرنے والوں میں ایک بڑی شخصیت مولانا محمد حسین آزاد کی ہے۔" جس طرح نظم جدید کی ابتدا کرنے کا سہرا آزاد کے سر ہے اسی طرح اردو نثر میں کئی قابل قدر اضافوں کا اعزاز بھی انھی کو حاصل ہے۔ "آبِ حیات" ان کا لازوال کارنامہ ہے۔ یہ اردو شاعری کی پہلی باقاعدہ تاریخ ہے جس میں ادوار قائم کر کے اردو شاعری کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آبِ حیات میں شاعروں کے حالات اس انداز سے پیش کیے گئے ہیں کہ ان کی چلتی پھرتی اور بولتی جاگتی تصویریں ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز کرنے والوں میں بھی آزاد پیش پیش نظر آتے ہیں۔ بے شک ان کی تنقید میں جانب داری نظر آتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ انھوں نے تنقید کی بنیاد ٹیڑھی رکھی۔ اس پر یہ جواب دیا گیا کہ یہ بات کچھ کم ہے کہ ٹیڑھی ہی سہی مگر انھوں نے تنقید کی بنیاد رکھی تو۔

ان کا دوسرا بے مثال کارنامہ وہ رمزیہ مضامین ہیں جو "نیرنگ خیال" میں شامل ہیں۔ "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ" کے عنوان سے جو افسانوی مضمون ہے اس میں جھوٹ کا نام دروغ دیوزاد اور سچ کا نام ملکہ صداقت زمانی رکھا گیا ہے اور دونوں کی معرکہ آرائی دکھائی گئی ہے۔ ایسے افسانوی مضامین کو انگریزی میں "الیگری" کہتے ہیں۔ اسے اردو میں تمثیل کہا جاتا ہے۔

"دربارِ اکبری" ان کی ایک اور اہم کتاب ہے۔ یہ شہنشاہ اکبر کے زمانے کی دلچسپ

تاریخ ہے۔ انداز ایسا ہے کہ اس عہد کی تصویریں آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہیں۔ سخندان فارس زبان کے مسئلے سے متعلق ہے۔ اس تصنیف کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ فارسی اور سنسکرت دونوں کی بنیاد ایک ہی ہے۔ گویا فارسی اور سنسکرت دو بہنیں تھیں جو ایک دوسرے سے بچھڑ گئیں اور آخر کار ہندوستان میں ان کا دوبارہ ملن ہوا۔ آزاد نے اردو کی ابتدائی جماعتوں کے لیے ریڈریں بھی لکھیں اور بچوں کے لیے "قصصِ ہند" کے نام سے تاریخ ہند کی کہانیاں بھی۔

طرز تحریر کے معاملے میں آج تک مولانا محمد حسین آزاد کا ثانی پیدا نہیں ہو سکا۔ ان کے اسلوب میں سادگی اور شیرینی گھل مل گئی ہے۔ تصویر کشی میں انھیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ جس چیز یا جس واقعے کا بیان کرتے ہیں اس کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں عجب طرح کا جادو ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں فوراً قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔ اسی صفت کو دیکھتے ہوئے علامہ شبلی نے فرمایا تھا کہ آزاد گپ بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔ "الفاظ و محاورات کا صحیح انتخاب، مناسب استعارہ و تشبیہ کا استعمال، تجسیم کا رجحان وہ خصوصیات ہیں جو آزاد کی تحریروں کو لازوال اور بے مثال بنا دیتی ہیں۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا ارشاد ہے کہ:

"آزاد کی عبارت میں بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی، انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کی حسن کاری سب یک جان ہو گئی ہیں۔"

(مولانا محمد حسین آزاد کی سوانح کے لیے ملاحظہ ہو حصہ نظم)

الطاف حسین حالی

۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء

اردو نثر کے فروغ میں مولانا الطاف حسین حالی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ صحت کی خرابی کے باوجود وہ برابر لکھتے رہے اور نہایت توجہ کے ساتھ لکھتے رہے۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور بلند پایہ نثر نگار بھی لیکن شاعری پر ان کی نثر کا پلہ بھاری ہے۔

حالی کی نثر نگاری کا آغاز ۱۸۶۷ء سے ہوا۔ سب سے پہلے انھوں نے مذہب سے متعلق ایک کتاب لکھی جس نے زیادہ شہرت نہیں پائی۔ ان کی پہلی اہم نثری تصنیف "مجالس النسا"

www.urduchannel.in

ہے۔ یہ عورتوں کی تعلیم سے متعلق ہے لیکن انداز ناول کا ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے سوانح نگاری اور تنقید کی طرف توجہ کی۔ حیاتِ سعدی لکھ کر انھوں نے اردو میں سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔ واقعات کے سلسلے میں انھوں نے چھان بین سے کام لیا اور سائنٹی فک انداز میں ایک عظیم فارسی شاعر کے مستند حالات پیش کر دیے۔ یہ کتاب ۱۸۸۲ء میں لکھی گئی۔ "یادگارِ غالب" مولانا کے قلم سے لکھی گئی دوسری کتاب ہے جسے غالب شناسی کی سمت میں پہلا قدم کہنا چاہیے۔ اس سے مولانا کی غالب فہمی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ البتہ درست ہے کہ غالب کی کمزوریوں کو وہ چھپا جاتے ہیں۔ ایک تو ان کا مزاج عیب جوئی کا نہ تھا، دوسرے غالب کو وہ اپنا استاد مانتے تھے۔

"حیاتِ جاوید" سرسید کی ضخیم اور مبسوط سوانح عمری ہے۔ مولانا حالی نے اس پر بہت محنت کی، مواد کی فراہمی کے لیے بار بار علی گڑھ آئے اور کافی دنوں یہاں مقیم رہے۔ انداز یہاں بھی وہی ہے کہ صاحبِ سوانح کی خامیوں پر اکثر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اسی لیے شبلی اس کتاب کو طنز سے "مدلّل مداحی" اور "کتاب المناقب" (یعنی تعریفوں سے لبریز کتاب) کہتے تھے۔ شبلی کی یہ سخت تنقید "حیاتِ جاوید" کی اہمیت اور افادیت کو گھٹا نہیں سکی۔

مولانا حالی کی سب سے اہم تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" ہے۔ یہ ان کے مجموعۂ نظم کا مقدمہ ہے لیکن اب ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں شاعری کے اصول زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اسے "اردو شاعری کا پہلا مینی فیسٹو" (منشور) کہا ہے۔ اس کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ حالی شاعری کی افادیت اور مقصدیت کے قائل تھے۔ انھوں نے کہا ہے کہ شاعری کو اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے اور تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ شاعری سے یہ کام لیا جاتا رہا ہے۔ پہلے حصّے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شاعری کے لیے کیا شرطیں ضروری ہیں۔ نیز یہ کہ شاعری میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ کتاب کے دوسرے حصّے میں شعری اصناف — غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی — کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

مولانا حالی کی نثر سادہ اور رواں ہونے کے ساتھ توانا اور پُر تاثیر ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے یہاں نہ مولوی نذیر احمد کا زورِ بیان ہے نہ علامہ شبلی کی سی شگفتگی و رعنائی۔ اس کے باوجود اس میں ایک خاص طرح کی دلکشی ہے جو اپنی بات کو واضح انداز میں پیش کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ آگے چل کر اردو میں جس نثر نے رواج پایا اس کی بنیاد حالی کی نثر پر ہے۔

(مولانا حالی کے سوانحی حالات کے لیے دیکھیں حصۂ نظم)

نذیر احمد

۱۸۳۶ء-۱۹۱۲ء

مولوی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے ان کے بارے میں ناول کے تحت تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن انھوں نے ناول کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا۔ انھوں نے کلامِ پاک کا بامحاورہ ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ اخلاق و مذہب سے متعلق جو کتابیں لکھیں ان میں سے چند کے نام ہیں الحقوق والفرائض، امہات الامہ، موعظۂ حسنہ۔ قواعد سے متعلق بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ انگریزی زبان انھوں نے باقاعدہ طور پر نہیں پڑھی تھی البتہ اپنی محنت سے کچھ استعداد بہم پہنچا لی تھی۔ ڈکشنری کی مدد سے انھوں نے "انڈین پینل کوڈ" کا "تعزیراتِ ہند" کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس ترجمے میں اور لوگ بھی شریک تھے۔ ان کا دوسرا اہم ترجمہ "قانونِ شہادت" ہے۔

مولوی نذیر احمد ایک بلند پایہ مقرر بھی تھے۔ بھاری تن و توش کے انسان تھے۔ آواز گرجدار تھی اس لیے بڑے سے بڑے مجمعے پر چھا جاتے تھے۔ قرآن و حدیث کے حوالوں سے وہ اپنی تقریر کو لائقِ احترام بنا دیتے تھے۔ عالم تھے اس لیے تقریر بہت جاندار ہوتی تھی۔ ان کا طریقہ تھا کہ لکچر پہلے سے لکھ لیتے تھے بلکہ چھپوا کر جلسے میں لاتے تھے لیکن بغیر دیکھے تقریر کرتے تھے اور تحریر و تقریر میں سرِ مو فرق نہ ہوتا تھا۔ ان کے خطبات شائع ہو چکے ہیں۔ عربی کے عالم تھے اس لیے تحریر و تقریر دونوں میں عربی کی عبارتیں بہت ہوتی تھیں۔ ان کی زبان ثقیل اور عربی آمیز ضرور ہے لیکن ان کی تحریروں اور تقریروں میں بلا کا زور اور جوش

www.urduchannel.in

پایا جاتا ہے۔

تہذیب الاخلاق کے لیے بھی مولوی صاحب پابندی سے مضامین لکھا کرتے تھے۔

ذکاء اللہ

۱۸۳۲ء - ۱۹۱۰ء

ذکاء اللہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ یہیں ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ثناء اللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی کالج میں داخلہ لے لیا۔ نذیر احمد اور محمد حسین آزاد بھی یہیں زیر تعلیم تھے۔ تینوں کے درمیان ایسے دوستانہ مراسم قائم ہوئے کہ زندگی بھر باقی رہے۔ ریاضی کے مضمون سے ذکاء اللہ کو خصوصی دلچسپی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اسی کالج میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد آگرہ کالج میں کچھ عرصہ اردو فارسی پڑھائی۔ پھر مدارس کے انسپکٹر کا عہدہ قبول کر لیا۔ بعد ازاں نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ آخر کار میور سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ عرصۂ دراز تک یہ خدمت انجام دی۔ پھر پنشن لے کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں دہلی میں وفات پائی۔

ذکاء اللہ کی علمی دلچسپیاں گوناگوں تھیں۔ انھیں بیک وقت بہت سے مضامین سے دلچسپی تھی۔ مولانا حالی نے اسی لیے ان کے دماغ کو بنیے کی دکان کہا ہے کیوں کہ اس میں بھانت بھانت کی معلومات جمع تھیں۔ انھوں نے ریاضی، طبیعیات، جغرافیہ، سیاست، تاریخ، اخلاق جیسے مختلف اور متضاد مضامین پر قلم اٹھایا اور کتابوں کا انبار لگا دیا۔ محققین نے ان کی تصانیف کی تعداد ۱۴۳ بتائی ہے۔ ان کی تصانیف میں تاریخ ہندوستان سب سے زیادہ اہم ہے جو دس جلدوں میں ہے۔ انھیں کتابوں پر انعامات بھی ملے۔ شمس العلماء کا خطاب بھی پایا مگر سچ تو یہ ہے کہ پر از معلومات ہونے کے باوجود زبان و بیان کے اعتبار سے ان کی تصانیف پھیکی اور پھسپھسی ہیں۔

سید احمد دہلوی

۱۸۴۶ء - ۱۹۱۸ء

سید احمد دہلی کے رہنے والے تھے۔ یہیں ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ 'رسوم دہلی' ان کی مشہور کتاب ہے جس میں دہلی

کے رسم و رواج کی مستند تفصیل درج ہے۔ طفلی نامہ اور ہادی النساء بھی ان کی تصانیف میں اہم ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے خاص طور پر عورتوں کے لیے کتابیں لکھیں لیکن جس کتاب کی وجہ سے ان کا نام زندہ ہے وہ فرہنگ آصفیہ ہے۔ یہ ضخیم لغت تحقیق اور عرق ریزی کی عمدہ مثال ہے۔ ۱۹۱۸ء میں وفات پائی۔

علامہ شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء

علامہ شبلی نعمانی نے عمر تو کم پائی۔ صرف ۵۷ برس کی عمر میں جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے لیکن ان کے قلم سے ایسی لاجواب تصانیف وجود میں آئیں کہ ان کا نام ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔

شبلی ۱۸۵۷ء میں بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے عالموں مثلاً مولوی شکر اللہ، مولوی محمد فاروق چریا کوٹی سے علم حاصل کیا۔ علم کی پیاس ایسی تھی کہ علم کے گہواروں میں بار بار لے جاتی تھی۔ چنانچہ سہارنپور، لاہور، رامپور اور لکھنؤ کے سفر کیے۔ والد وکیل تھے۔ یہ علم سے فارغ ہو گئے تو ان کے حکم کی تعمیل میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ وکالت شروع بھی کی لیکن اس پیشے کے لیے وہ بنے ہی نہیں تھے۔ کچھ دنوں سرکاری ملازمت کی اور امین دیوانی کے فرائض انجام دیے مگر یہ کام بھی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ آخر کار اس سے بھی استعفیٰ دے دیا۔

حسن اتفاق کہ چھوٹے بھائی سے ملنے ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ آئے۔ سرسید سے نیاز حاصل ہوا۔ ان کی مردم شناس نظروں نے جوہر قابل کو پہچان لیا اور شبلی کا کالج میں فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ یہاں کی علمی فضا شبلی کی تصنیفی صلاحیتوں کو بہت راس آئی۔ ان پر سرسید کے کتب خانے کے دروازے کھل گئے۔ سرسید، حالی، محسن الملک اور آرنلڈ سے ملاقاتیں رہیں۔ شبلی کی تصنیفی زندگی کا یہاں آغاز ہو گیا۔ اپنی کتابوں کے لیے مواد حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے بیرونی ممالک کا سفر بھی کیا۔ سرسید کی وفات کے بعد انھوں نے علی گڑھ چھوڑ دیا۔ سید علی بلگرامی کے اصرار پر حیدر آباد گئے۔ وہاں محکمہ تعلیم

Lightshot

www.urduchannel.in

کے ناظم مقرر ہوئے۔ وہاں بھی کئی کتابیں لکھیں۔

اس اثنا میں معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی حالت سقیم ہے۔ اس کی اصلاح کی غرض سے حیدرآباد کی ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں کے قدامت پسندوں نے شبلی کی پالیسی کو ناپسند کیا تو اس سے کنارہ کش ہو کر اعظم گڈھ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی اور اپنی جائیداد اس کے لیے وقف کر دی۔

شبلی کی علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ترکی کے سلطان نے انھیں تمغۂ مجیدی عنایت فرمایا۔ ۱۹۱۴ء میں ان کی وفات ہوگئی۔

شبلی نے بہت سی کتابیں لکھیں ان میں سے اہم ہیں المامون، الفاروق، سیرت النبی، علم الکلام، شعرالعجم، موازنۂ انیس و دبیر۔ المامون اور اور الفاروق سیرت و سوانح کا اچھا نمونہ ہے۔ سیرت النبی ان کی آخری تصنیف ہے جو وفات کے سبب ناتمام رہی۔ آخر ان کے لائق شاگرد سید سلیمان ندوی نے اسے مکمل کیا۔

شعرالعجم فارسی شاعری سے متعلق ہے۔ اس کی چوتھی جلد میں اصول شعر سے بحث کی کی گئی ہے۔ تنقید کی تاریخ میں اس کا اہم مقام ہے۔ موازنہ انیس و دبیر شبلی کے شعری ذوق اور انیس شناسی کی عمدہ مثال ہے۔

تحقیق و تلاش شبلی کا مزاج تھا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا بڑی چھان بین کے بعد لکھا لیکن جو خصوصیت انھیں اس زمانے کے دوسرے تمام مصنفوں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا دلکش طرز تحریر ہے۔ شبلی اچھے شاعر بھی تھے۔ نثر میں بھی وہ شعری وسائل خاص طور پر وہ تشبیہ و استعارہ سے کام لیتے ہیں۔ بہت غور و فکر کے بعد مترنم الفاظ و تراکیب کا انتخاب کرتے ہیں۔ شگفتگی و رعنائی کے ساتھ ان کی عبارت پرجوش بھی ہوتی ہے اور پڑھنے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ان کے مضامین و مکاتیب بھی ہمارے ادب کا انمول خزانہ ہیں۔

اردو نثر کی تاریخ میں یہ عہد ایسا شاندار ہے کہ بہت سے بلند پایہ مصنف اردو نثر کے ذخیرے میں بیش قیمت کتابوں کا اضافہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک سید علی بلگرامی ہیں۔ وہ زبان دانی کی عجیب صلاحیت رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی، فرانسیسی اور بعض دیگر زبانوں میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے فرانسیسی کتابوں کے ترجمے کیے جن پر تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔

مولوی وحیدالدین سلیم کچھ دنوں سرسید کے لٹریری سکریٹری رہے۔ یہیں سے ان کو تصنیفی کاموں کی تربیت ملی۔ وہ پانی پت کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لاہور گئے۔ آخر میں حیدرآباد کے دارالترجمہ سے وابستہ رہے۔ بعد ازیں عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ "وضع اصطلاحات" ان کا گراں قدر کارنامہ ہے۔

مہدی افادی نے بہت کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا اسے قدردانوں نے آنکھوں سے لگایا۔ ان کی خصوصیت دلچسپ اور رنگین اسلوب نگارش ہے۔

ناصر علی دہلوی، دلگیر الہ آبادی اور ناصر نذیر فراق اس عہد کے اچھے نثر نگار ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس دور میں بلند پایہ نثر نگاروں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔

---

www.urduchannel.in

۵

ناول

قصہ سننا اور قصہ سنانا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ جب اسے فرصت تھی تو ایسے قصے پسند کرتا تھا جو جلدی ختم نہ ہوں اور جن میں خیالی دنیا کی باتیں ہوں، جن میں جنوں، پریوں، دیوؤں یا پھر بادشاہوں اور شہزادوں اور شہزادیوں کا ذکر ہو تاکہ اس کے تخیل کو خوب سیر کرنے کا موقع ملے۔ ایسے قصے داستان کہلاتے ہیں۔ اور شاید دنیا کے ہر خطے میں پائے جاتے ہیں۔ داستان کی ایک پہچان تو یہ ہے کہ وہ بہت طویل ہوتی ہے۔ آسانی سے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بات میں بات نکلتی چلی آتی ہے۔ دوسرے اس میں ہماری اصلی دنیا کی نہیں بلکہ خیالی دنیا کی ناقابلِ یقین باتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ایسے دیو جو شہزادے کو مع پلنگ اڑا لے جائیں۔ ایسا سرمہ جو آنکھ میں لگا لو تو زمین میں گڑے خزانے نظر آنے لگیں۔ ایسی جادوئی ٹوپی کہ جو اوڑھ لے کسی کو دکھائی نہ دے۔ یہ باتیں وہ ہیں جو خلافِ فطرت ہیں اور عقل میں نہیں آتیں۔ اس لیے انھیں فوق فطری عناصر کہا جاتا ہے۔

اسی داستان کی کوکھ سے ناول نے جنم لیا۔ ہوا یوں کہ جب زمانے کا ورق پلٹا اور انسان سمجھ دار ہو گیا تو اسے خیال آیا کہ ان ہوائی اور فرضی باتوں سے کیا فائدہ۔ اپنی اصلی اور حقیقی دنیا کی باتیں کرو۔ ایسے قصے سنو اور سناؤ جو ہماری اپنی زندگی سے جڑے ہوئے ہوں تاکہ اصلی دنیا کو سمجھنے میں مدد ملے اور فرصت کم ہے اس لیے غیر ضروری طوالت کو

بھی اب طاق میں رکھو۔ فوق فطری عناصر قصے سے خارج ہوئے اور قصے کی لمبائی کم ہو گئی تو ناول وجود میں آگیا۔

ناول کیا ہے؟

ناول ایک ایسا نثری قصہ ہے جس میں ہماری حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہماری امنگیں اور آرزوئیں جھلکتی ہیں جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہمارے سامنے کیا مشکلیں آتی ہیں اور ہم ان پر کس طرح قابو پاتے ہیں۔ گویا ناول زندگی کی تصویر کشی کا فن ہے۔ اب یہ بھی دیکھتے چلیں کہ لفظ "ناول" کے کیا معنی ہیں۔ ناول اطالوی زبان کے لفظ "ناویلا" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں نیا۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ ناول ایک نئی چیز تھی۔ اردو میں ناول انگریزی ادب کے راستے سے آیا۔ ہمارے اہلِ قلم نے انگریزی ناول دیکھے اور پسند کیے تو داستان کو تج دیا اور اور ان کی جگہ ناول کو اپنا لیا۔

ناول کے اجزائے ترکیبی

اگلا سوال یہ ہے کہ ناول کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؛ یعنی وہ کیا چیزیں ہیں جن کا ناول میں پایا جانا ضروری ہے۔ فنی اعتبار سے ناول کے لیے مندرجہ ذیل چھ چیزیں درکار ہوتی ہیں۔

(۱) قصہ (۲) پلاٹ (۳) کردار نگاری (۴) مکالمہ نگاری (۵) منظر کشی (۶) نقطۂ نظر۔

قصہ ــــ ناول کی بنیاد کسی نہ کسی واقعے، کسی نہ کسی قصے پر ہوتی ہے۔ جدید دور میں قصے سے بغاوت کی گئی اور کہا گیا کہ ناول کے لیے قصے کا ہونا ضروری نہیں۔ یہ خیال درست نہیں۔ ناول میں قصہ بلکہ قصہ پن نہ ہو تو اس میں دلچسپی ہی نہ رہے۔ ناول وجود میں ہی اس طرح آتا ہے کہ کوئی قصہ، کوئی واقعہ وجود میں آیا اور اسے لکھ دیا گیا۔ جو ناول پڑھتا ہے اس کی ساری توجہ اسی پر رہتی ہے کہ کیا ہوا اور آگے کو کیا ہونے والا ہے۔

پلاٹ ــــ ناول میں ایک کے بعد ایک واقعات پیش آتے رہتے ہیں جنھیں ناول نگار سلیقے کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ واقعات کی اسی لڑی کا نام پلاٹ ہے۔

www.urduchannel.in

واقعات کی ترتیب بہت بے عیب ہونی چاہیے۔ یعنی ایک کے بعد جب دوسرا واقعہ پیش آئے تو عقل تسلیم کرے کہ بیشک ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اسی کا نام منطقی ترتیب ہے اور ایسے ہی پلاٹ کو مربوط یا گٹھا ہوا پلاٹ کہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو پلاٹ غیر مربوط یا ڈھیلا ڈھالا کہلائے گا۔ "امراؤ جان ادا" ناول کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔

پلاٹ یا تو سادہ ہوتا ہے یعنی اس میں ایک قصہ ہوتا ہے یا مرکب ہوتا ہے اس میں دو یا دو سے زیادہ قصے ایک ساتھ چلتے ہیں۔ مرکب پلاٹ کو نبھا لینا کسی اچھے فن کار کے ہی بس کی بات ہے۔ امراؤ جان میں دو قصے ساتھ ساتھ چلتے ہیں ایک امیرن کا دوسرا رام دئی کا۔

کردار نگاری ــــ ناول میں مسلسل عمل ہوتا ہے یعنی واقعات پیش آتے ہیں۔ یہ واقعات افراد کے ذریعے ہی پیش آتے ہیں۔ ان افراد قصہ کو کردار کہتے ہیں۔ کرداروں کی پیش کش کردار نگاری کہلاتی ہے جو ناول کا تیسرا اہم جزو ہے۔

ناول پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہونا چاہیے کہ کردار اصلی زندگی سے لیے گئے ہیں۔ ان میں حقیقت کا رنگ جتنا زیادہ ہوگا ناول اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ کردار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک پیچیدہ (راؤنڈ)، دوسرے سپاٹ (فلیٹ)۔ جو کردار جیتے جاگتے ہوتے ہیں اور زندگی کے مختلف پہلو پیش کرتے ہیں وہ راؤنڈ کہلاتے ہیں۔ جو زندگی کا صرف ایک رخ پیش کرتے ہیں مثلاً اچھے ہیں تو اچھے اور برے ہیں تو برے وہ سپاٹ کہلاتے ہیں کیوں کہ اصل زندگی میں انسان حالات کے مطابق تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے کردار مبتلا اور کلیم مرزا ہادی رسوا کے کردار امراؤ جان اور گوہر مرزا پریم چند کے امرکانت اور ہوری جیتے جاگتے کردار ہیں۔

مکالمہ نگاری ــــ کردار کو جاننے اور سمجھنے کا سب سے اچھا ذریعہ وہ بات چیت ہے جو کردار آپس میں کرتے ہیں۔ یہ گفتگو مکالمہ کہلاتی ہے اور ناول کا چوتھا اہم جزو ہے۔ جس کردار کو جس موقعے پر جو بات کہنی چاہیے فن کار کے لیے ضروری ہے کہ اس کے

منھ سے وہی بات ادا کرائے۔ مطلب یہ کہ مکالمے فطری، مناسب، موزوں، واضح اور مختصر ہوں۔ ناول کے مکالمے ہی تو ہیں جو کرداروں کے ذہن سے پردہ ہٹاتے ہیں مصنوعی بے مزہ مکالمے ناول کے فنی حسن کو برباد کر دیتے ہیں۔ نذیر احمد، سرشار، رسوا اور پریم چند مکالمہ نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔

منظر کشی ــــ کامیاب منظر کشی ناول کو دلکش اور پر تاثیر بنا دیتی ہے۔ مطلب یہ کہ کسی مقام کا ذکر کیا جا رہا ہے یا کوئی واقعہ بیان کیا جا رہا ہے تو فن کار اس کی تصویر کھینچ دے اور پڑھنے والے کو معلوم ہو کہ وہ خود جائے واردات پر موجود ہے اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ گویا منظر نگاری پس منظر کا ہی ایک حصہ ہے۔ منظر کشی کے نقطۂ نظر سے امراؤ جان ادا ایک کامیاب ناول ہے۔

نقطۂ نظر ــــ ہر فن کار کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے اور اس کی ہر تخلیق میں کارفرما رہتا ہے لیکن کسی ناول میں نقطۂ نظر بہت واضح اور نمایاں ہو جائے تو ناول کے حسن میں کمی آجاتی ہے۔ کسی موج تہ نشیں کی طرح نقطۂ نظر کو ناول میں جاری و ساری تو ضرور ہونا چاہیے مگر ایسا نہ ہونا چاہیے کہ یہ فن پر حاوی ہو جائے اور ناول کے حسن کو مجروح کر دے۔

اردو ناول کا ارتقا

اردو میں ناول کا آغاز انگریزی ادب کے اثر سے ہوا۔ مولوی نذیر احمد اور پنڈت رتن ناتھ سرشار وہ فن کار ہیں جنھوں نے پہلے پہل اردو میں ناول لکھے۔ نذیر احمد کی مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی اور اسی کو اردو کا پہلا ناول کہنا چاہیے۔ یہ اکبری اور اصغری دو بہنوں کا قصہ ہے جن میں سے ایک سلیقہ مند ہے اور دوسری پھوہڑ۔ ایک گھر کو جنت بنا دیتی ہے تو دوسری دوزخ۔ آخر کار اسے بھی عقل آجاتی ہے۔ قصہ، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمے، منظر کشی، نقطۂ نظر

www.urduchannel.in

ناول میں سب کچھ موجود ہے مگر مقصدیت فن پر غالب ہے۔ دوسری خامی یہ کہ انداز تمثیلی ہے۔ اس لیے بعض لوگوں نے نذیر احمد کی تخلیقات کو ناول ماننے سے انکار کیا ہے لیکن وہ اردو میں ایک نئی چیز کا آغاز کر رہے تھے اور اس زبان میں ناول کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا اس لیے نذیر احمد کے ناولوں میں خامیاں ضرور ہیں مگر وہ ہیں اردو میں ناول کا نقش اوّل ہی۔

مولوی نذیر احمد نے اردو میں ناول کی بنیاد ڈالی تو پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کی سب سے مقبول تصنیف "فسانۂ آزاد" ہے۔ لکھنؤ کے جاگیردارانہ ماحول کی تصویرکشی، ظریفانہ اندازِ بیان، آزاد اور خوجی کے دلچسپ کردار، چست اور برمحل مکالمے اس کی مقبولیت کا راز ہیں لیکن "فسانۂ آزاد" کی خامی یہ ہے کہ اس کا کوئی پلاٹ نہیں۔ تسلسل ناپید ہے۔ آزاد اور خوجی کے کردار دلچسپ ضرور ہیں مگر اصلیت سے دور۔ اس لیے فنی اعتبار سے فسانۂ آزاد کو ناول کہنا دشوار ہے لیکن یہاں بھی ہمیں یہی عرض کرنا ہے کہ یہ نثری صنف ابھی بچپن کے عالم میں تھی اس لیے خامیوں کا پایا جانا باعثِ حیرت نہیں۔

اردو ناول کا اگلا دور تاریخی ناولوں کا دور ہے۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ اور محمد علی طبیبؔ نے تاریخی ناول لکھ کر اسلام کے شاندار ماضی کو دہرایا۔ شررؔ کی "عبدالعزیز ورجینا" دلچسپ ہے لیکن "فردوسِ بریں" ان کا شہکار ہے۔ شررؔ کی کردار نگاری کمزور ہے۔ دوسرے ان کے یہاں تبلیغ اسلام کا جوش زیادہ نظر آتا ہے۔ طبیبؔ کے تاریخی ناول شررؔ کے ناولوں سے کم رتبہ ہیں۔ "نیل کا سانپ" اور "عبرت" کو کسی حد تک دلچسپ کہا جا سکتا ہے۔

سجاد حسین (اڈیٹر اودھ پنچ) کے ناول کایا پلٹ، حاجی بغلول اور احمق الذین بھی اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئے۔ مرزا عباس حسین کا "ربط ضبط" اور جوالا پرشاد برق کے تراجم بھی اسی دور کے اہم اضافے ہیں۔

اردو ناول کا اگلا عہد اردو ادب کی تاریخ میں ایک یادگار عہد ہے۔ اس عہد میں مرزا محمد ہادی رسوا کا "امراؤ جان ادا" وجود میں آیا۔ انھوں نے اور ناول بھی لکھے مثلاً ذات شریف

اور شریف زادہ لیکن جس کارنامے نے انھیں زندگی جاوید عطا کی وہ "امراؤ جان ادا" ہے جو ہر لحاظ سے ایک بہترین اور مکمل ناول ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے وسط کا لکھنؤ بھر سے جی اٹھا ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری، مکالمے، منظرکشی، زبان و بیان ہر لحاظ سے یہ ناول اردو ادب کا شہکار ہے۔

مولانا راشد الخیری کو "مصورِ غم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی مسلم خواتین پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور ہمارے معاشرے میں ان کی جو دردناک حالت ہے ناولوں میں اس کی تصویر کھینچی۔ ان کے ناولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

اس کے بعد اردو ناول کی دنیا میں ایک ایسے فن کار نے قدم رکھا جس کے جادو نگار قلم سے چھو کر اردو ناول کندن ہو گیا۔ یہ پریم چند ہیں جنھیں جدید اردو ناول کا بانی کہنا مناسب ہو گا اس وقت جو مسائل درپیش تھے پریم چند نے ان کو اپنے ناولوں میں جگہ دی اور ادب کو نئی سماجی حقیقت نگاری سے آشنا کیا۔ نئی تکنیک بھی ان کے یہاں نظر آتی ہے۔ ان کی انسان دوستی نے اردو ناول کو ہر دل عزیز بنایا۔ انھوں نے بہت سے ناول لکھے جن میں سے بہت اہم ناول یہ ہیں: گئو دان، میدانِ عمل، بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، چوگانِ ہستی۔

پریم چند نے ہندوستان کے دیہات کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا اور دیہات کے مسائل سے وہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کے ناولوں میں دیہات اور دیہات کے مسائل بہت سلیقے کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں۔ انسانی نفسیات کے وہ نباض ہیں اس لیے کردار نگاری میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ پریم چند اب تک اردو کے سب سے بڑے ناول نگار ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے بھی اردو ناول کو بہت کچھ دیا۔ اس تحریک کا آغاز پریم چند کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا بلکہ انھوں نے اس کی سرپرستی بھی کی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ناول نگاروں نے محنت کشوں کی امنگوں کی ترجمانی کی، وقت کے تقاضوں کو سمجھا۔ زندگی اور ادب کے رشتے کو اجاگر کیا اور اردو ناول کو نئی راہیں دکھائیں۔ اس سلسلے میں سجاد ظہیر کا

www.urduchannel.in

ناول میں سب کچھ موجود ہے مگر مقصدیت فن پر غالب ہے۔ دوسری خامی یہ کہ انداز تمثیلی ہے۔ اس لیے بعض لوگوں نے نذیر احمد کی تخلیقات کو ناول ماننے سے انکار کیا ہے لیکن وہ اردو میں ایک نئی چیز کا آغاز کر رہے تھے اور اس زبان میں ناول کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا اس لیے نذیر احمد کے ناولوں میں خامیاں ضرور ہیں مگر وہ ہیں اردو میں ناول کا نقش اوّل ہی۔

مولوی نذیر احمد نے اردو میں ناول کی بنیاد ڈالی تو پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کی سب سے مقبول تصنیف "فسانۂ آزاد" ہے۔ لکھنؤ کے جاگیردارانہ ماحول کی تصویر کشی، ظریفانہ اندازِ بیان، آزاد اور خوجی کے دلچسپ کردار، چست اور برمحل مکالمے اس کی مقبولیت کا راز ہیں لیکن "فسانۂ آزاد" کی خامی یہ ہے کہ اس کا کوئی پلاٹ نہیں۔ تسلسل ناپید ہے۔ آزاد اور خوجی کے کردار دلچسپ ضرور ہیں مگر اصلیت سے دور۔ اس لیے فنی اعتبار سے فسانۂ آزاد کو ناول کہنا دشوار ہے لیکن یہاں بھی ہمیں یہی عرض کرنا ہے کہ یہ نثری صنف ابھی بچپن کے عالم میں تھی اس لیے خامیوں کا پایا جانا باعثِ حیرت نہیں۔

اردو ناول کا اگلا دور تاریخی ناولوں کا دور ہے۔ مولانا عبدالحلیم شرر اور محمد علی طبیب نے تاریخی ناول لکھ کر اسلام کے شاندار ماضی کو دہرایا۔ شرر کی "عبدالعزیز ورجینا" دلچسپ ہے لیکن "فردوسِ بریں" ان کا شہکار ہے۔ شرر کی کردار نگاری کمزور ہے۔ دوسرے ان کے یہاں تبلیغ اسلام کا جوش زیادہ نظر آتا ہے۔ طبیب کے تاریخی ناول شرر کے ناولوں سے کم رتبہ ہیں۔ "نیل کا سانپ" اور "عبرت" کو کسی حد تک دلچسپ کہا جا سکتا ہے۔

سجاد حسین (ایڈیٹر اودھ پنچ) کے ناول کایا پلٹ، حاجی بغلول اور احمق الذیں بھی اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئے۔ مرزا عباس حسین کا "ربط ضبط" اور جوالا پرشاد برق کے تراجم بھی اسی دور کے اہم اضافے ہیں۔

اردو ناول کا اگلا عہد اردو ادب کی تاریخ میں ایک یادگار عہد ہے۔ اس عہد میں مرزا محمد ہادی رسوا کا "امراؤ جان ادا" وجود میں آیا۔ انھوں نے اور ناول بھی لکھے مثلاً ذات شریف

اور شریف زادہ لیکن جس کارنامے نے انھیں زندگیِ جاوید عطا کی وہ "امراؤ جان ادا" ہے جو ہر لحاظ سے ایک بہترین اور مکمل ناول ہے۔ اس میں انیسویں صدی کے وسط کا لکھنؤ پھر سے جی اٹھا ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری، مکالمے، منظر کشی، زبان و بیان ہر لحاظ سے یہ ناول اردو ادب کا شہکار ہے۔

مولانا راشد الخیری کو "مصورِ غم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی مسلم خواتین پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور ہمارے معاشرے میں ان کی جو دردناک حالت ہے ناولوں میں اس کی تصویر کھینچی۔ ان کے ناولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

اس کے بعد اردو ناول کی دنیا میں ایک ایسے فن کار نے قدم رکھا جس کے جادو نگار قلم سے چھو کر اردو ناول کندن ہو گیا۔ یہ پریم چند ہیں جنھیں جدید اردو ناول کا بانی کہنا مناسب ہوگا اس وقت جو مسائل درپیش تھے پریم چند نے ان کو اپنے ناولوں میں جگہ دی اور ادب کو نئی سماجی حقیقت نگاری سے آشنا کیا۔ نئی تکنیک بھی ان کے یہاں نظر آتی ہے۔ ان کی انسان دوستی نے اردو ناول کو ہر دل عزیز بنایا۔ انھوں نے بہت سے ناول لکھے جن میں سے بہت اہم ناول یہ ہیں: گئودان، میدانِ عمل، بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، چوگانِ ہستی۔

پریم چند نے ہندوستان کے دیہات کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا اور دیہات کے مسائل سے وہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کے ناولوں میں دیہات اور دیہات کے مسائل بہت سلیقے کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں۔ انسانی نفسیات کے وہ نباض ہیں اس لیے کردار نگاری میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ پریم چند اب تک اردو کے سب سے بڑے ناول نگار ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے بھی اردو ناول کو بہت کچھ دیا۔ اس تحریک کا آغاز پریم چند کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا بلکہ انھوں نے اس کی سرپرستی بھی کی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ناول نگاروں نے محنت کشوں کی امنگوں کی ترجمانی کی، وقت کے تقاضوں کو سمجھا۔ زندگی اور ادب کے رشتے کو اجاگر کیا اور اردو ناول کو نئی راہیں دکھائیں۔ اس سلسلے میں سجاد ظہیر کا

www.urduchannel.in

"لندن کی ایک رات"، قاضی عبدالغفار کا "لیلیٰ کے خطوط"، عصمت چغتائی کا "ٹیڑھی لکیر"، قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا"، کرشن چندر کا "شکست" اور عزیز احمد کا "گریز" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سجاد ظہیر کے ناول "لندن کی ایک رات" میں بعض ایسے رجحانات نظر آتے ہیں جو اردو ناول میں پہلی بار داخل ہوئے۔ یہاں ہم کرداروں کی ذہنی کشمکش سے روشناس ہوتے ہیں۔ فن کار نے اس ناول میں نفسیاتی تجزیے کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے بھی یہی تکنیک اختیار کی ہے اور خطوط کی شکل میں مرکزی کردار کا ذہنی خلفشار پیش کر دیا ہے۔

عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے ناول میں جگہ دی ہے، ان کے جذباتی اور جنسی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اور نفسیاتی تحلیل کا طریق کار اپنایا ہے۔ اس لیے ان کے ناولوں میں جا بجا عریانی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کا ناول "ٹیڑھی لکیر" خاصا مقبول رہا ہے۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہے۔

کرشن چندر نے اشتراکی خیالات کا فن کارانہ انداز میں پرچار کیا۔ "شکست" میں ایک ایسے نوجوان کی کہانی بیان ہوئی ہے جس میں ہمت کی کمی ہے۔ ذات پات اور سماجی بندھنوں سے وہ عاجز ہے مگر اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ کرشن چندر بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے مگر بسیار نویسی نے ان کے فن کو نقصان پہنچایا۔

اس دور میں عزیز احمد نے بھی اپنے فن کا سکہ جمایا۔ ایسی بلندی ایسی پستی، گریز اور ہوس جیسے کامیاب ناول ان کے قلم کے رہینِ منت ہیں۔ ان میں گریز سب سے زیادہ مقبول ہوا۔

ہمارے عہد کی سب سے سربرآوردہ ناول نگار قرۃ العین حیدر ہیں۔ ان کی شہرت زیادہ تر اس نئی تکنیک کے سبب ہے جسے شعور کی رو کہا جاتا ہے اور جسے انھوں نے بڑے سلیقے کے ساتھ برتا ہے۔ اب تک اردو ناول میں اس تکنیک کے استعمال کی بہترین مثال

"آگ کا دریا" ہے۔ میرے بھی صنم خانے، آخر شب کے ہمسفر، چاندنی، گردشِ رنگِ چمن ان کے مقبول ناول ہیں۔ اعلیٰ طبقے کی زندگی قرۃ العین حیدر بڑی چابکدستی سے پیش کرتی ہیں۔

موجودہ صدی کا یہ نصف آخر جس میں ہم آپ سانس لے رہے ہیں، ناول کے نقطۂ نظر سے خاص طور پر زرخیز ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ایک عرصے تک ہجرت اور جلا وطنی پر ہمارے فنکاروں کی توجہ مرکوز رہی۔ پھر دھیرے دھیرے یہ دائرہ بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں، ذہنی کشمکش، رفتہ رفتہ اردو ناول میں زیادہ جگہ پاتی گئیں۔ اس میں زیادہ گہرائی آتی گئی اور ماضی قریب میں ایسے بہت سے ناول لکھے گئے جن پر ترقی یافتہ زبانیں بھی رشک کر سکتی ہیں۔ ان میں سے اہم کی فہرست تو یہاں پیش کی جا سکتی ہے لیکن ان کے بارے میں اظہارِ خیال کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہ فہرست کچھ اس طرح ہے۔

عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" اور "باگھ"، شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی"، خدیجہ مستور کا "آنگن"، حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول"، راجندر سنگھ بیدی کا "ایک چادر میلی سی"، بلونت سنگھ کا "معمولی لڑکی"، قاضی عبدالستار کا "شب گزیدہ"، مہندر ناتھ کا "ارمانوں کی سیج"، جمیلہ ہاشمی کا "تلاشِ بہاراں" اور "روہی"، جیلانی بانو کا "ایوانِ غزل"، انور سجاد کا "خوشیوں کا باغ"، انتظار حسین کا "بستی"، سلیم اختر کا "ضبط کی دیوار" ہمارے عہد کے لازوال ناول ہیں۔

ناول نگار

اردو کے اہم ناول نگاروں کی فہرست بھی بہت طویل ہے لیکن ان سب کا ذکر یہاں ممکن نہیں، اس لیے بے حد اہم ناول نگاروں کا انتخاب کرنا پڑا۔ پچھلی تین چار دہائیوں میں جو فن کار ابھرے ہیں انھیں اس لیے قلم انداز کیا جا رہا ہے کہ ابھی قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ادب کی دنیا میں ان میں سے کون ابدی زندگی پا سکیں گے۔

www.urduchannel.in

نذیر احمد

۱۸۳۶ء - ۱۹۱۲ء

اردو ناول پر مولوی نذیر احمد کا بڑا احسان ہے کہ اردو میں اس صنف کی بنیاد انھی کے مبارک ہاتھوں سے پڑی۔ یہ ناول ایسے پسند کیے گئے کہ حکومت نے انعام سے نوازا اور ہر طرف سے واہ واہ ہوئی مولوی صاحب نے پے در پے کئی ناول لکھے۔ انھوں نے پہلا ناول اپنے بچوں کے لیے لکھا تھا اور خود مولوی صاحب کے الفاظ میں "یہ کتاب بچوں کو ایسی بھائی کہ جس کو پاؤ صفحہ پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لیے اور جس کو ایک صفحے کی استعداد تھی وہ پورے ورق کے لیے بیقرار تھا۔" سبب یہ کہ کتاب تھی ہی اتنی دلچسپ مگر اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے مولوی صاحب کی کتابِ زندگی۔ آئیے پہلے اسی کی ورق گردانی کریں۔

نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے اپنے بیٹے کا ہاتھ تعلیم کے لیے مولوی عبدالخالق کے ہاتھ میں دے دیا تو وہ دہلی چلے آئے۔ مولوی عبدالخالق کشمیری دروازے کے پاس پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں مدرس تھے۔ نذیر احمد وہیں رہنے لگے۔ کھانے کی صورت یہ تھی کہ طالب علم چھیڑا لے کر نکل جاتے اور گھر گھر سے کھانا مانگ لاتے۔ نذیر احمد کی ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ مولوی صاحب کے گھر کا سودا سلف لانا پڑتا تھا۔ ان کی سنگدل پوتی طرح طرح نذیر احمد کو ستاتی اور انگلیوں پر سل کا بٹا مار مار کے اپنے گھر اور سالے محلے کا مصالحہ باریک پسواتی تھی۔

ایک دن یہ سودا لینے اجمیری دروازے گئے۔ دلی کالج میں بہت بھیڑ تھی۔ لڑکوں کا زبانی امتحان ہو رہا تھا۔ یہ بھی تماشا دیکھنے جا گھسے اور دھکا کھا کے گر پڑے۔ انگریز پرنسپل نے اٹھایا، دل جوئی کے لیے ایک دو سوال کیے جن کے نتیجے میں انھیں داخلہ مل گیا۔ محنتی اور ذہین تو تھے ہی، خوب جی لگا کر پڑھا۔ بہت ترقی کی۔ یہاں ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، منشی کریم الدین اور پیارے لال آشوب ہم سبق تھے۔ ان کی صحبتوں سے طبیعت کو اور جلا ملی۔

مولوی عبدالخالق نے اس لڑکے کو ترقی کے پر لگا کے اڑتے دیکھا تو اپنی پوتی اسے

بیاہ دی، وہی پوتی جس کے یہ ستائے ہوئے تھے۔ ساری زندگی وہ اسے انگلیوں پر زخموں کے نشان دکھا دکھا کے ستاتے رہے کہ دیکھ نیک بخت یہ تیری مار کی نشانیاں ہیں۔ وہ بیچاری شرما کے سر جھکا لیتی۔

کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولوی صاحب پنجاب میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ تنخواہ پچیس روپے پاتے تھے۔ اس کے بعد تحصیلدار پھر افسر بندوبست ہو گئے۔ بعد ازاں سر سالار جنگ اوّل نے آٹھ سو روپے ماہانہ پر حیدرآباد بلا لیا۔ ترقی پا کر یہ نمبر مال ہو گئے اور سترہ سو روپے تنخواہ ہو گئی۔ ۱۸۸۳ء میں سر سالار جنگ نے وفات پائی۔ مولوی صاحب ملازمت سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے آئے اور باقی زندگی یہیں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ ۱۸۹۷ء میں ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

* * *

مولوی نذیر احمد نے بہت سی کتابیں لکھیں لیکن ان کی شہرت کا اصل مدار ان کے ناولوں پر ہے۔ "مراۃ العروس" ان کا پہلا ناول ہے جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔ یہ کتاب وہ اپنی بیٹی کو اردو سکھانے کے لیے قسط وار لکھ کر دیتے رہے۔ کتاب ایسی مزے دار تھی کہ وہ جی لگا کے اسے پڑھتی اور تقاضا کر کے آگے کو لکھواتی رہی۔ ایک انگریز افسر کی فرمائش پر اسے چھپوایا گیا۔ حکومت نے اس کتاب پر انعام دیا۔ مسلمان گھرانوں میں اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ عام لوگ اسے "اکبری اصغری کا قصہ" اور مولوی صاحب کو "اکبری اصغری والے مولوی صاحب" کہنے لگے تھے۔ یہ ناول لڑکیوں کی تربیت کے سلسلے میں ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک معمولی لڑکی کس طرح ایک گھرانے کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

دوسرا ناول "بنات النعش" دراصل پہلے ناول ہی کا حصہ ہے جو ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔

www.urduchannel.in

موضوع یہ ہے کہ لڑکیوں کو دستکاری کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔

"توبۃ النصوح" (۱۸۷۷ء) نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے جسے ان کا شہکار کہا جاتا ہے۔ نصوح ایک خواب دیکھنے کے بعد اپنے پورے خاندان کی اصلاح پر متوجہ ہوتا ہے مگر اپنے بیٹے کلیم کی اصلاح میں ناکام رہتا ہے۔ مصنف کا معرکہ آرا کردار "مرزا ظاہر دار بیگ" اسی ناول کا کردار ہے۔ ناول کا مقصد ہے بچوں کی اصلاح و تربیت کی اہمیت واضح کرنا۔

"ابن الوقت" (۱۸۸۸ء) میں انگریزی معاشرت کی اندھا دھند تقلید کی مذمت کی گئی ہے۔ "رویائے صادقہ" میں مذہبی عقائد کے سلسلے میں معلومات پیش کی گئی ہے۔ "فسانۂ مبتلا" میں ایک سے زیادہ شادیوں کے نقصانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "ایامیٰ" میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ بیوہ عورتوں کی دوسری شادی ضروری ہے۔

نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ بعض لوگوں کا اصرار ہے کہ ان کے قصے ناول نہیں تمثیلیں ہیں مگر یہ درست نہیں۔ یہ البتہ درست ہے کہ ان ناولوں میں کچھ نقص پائے جاتے ہیں۔ ان کے سامنے اردو میں ناول کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ اردو میں وہ اس صنف کا آغاز کر رہے تھے۔ جب کسی چیز کا پہلا نقش تیار کیا جاتا ہے تو اس میں ضرور کچھ نہ کچھ خامیاں رہ جاتی ہیں۔ بس اسی طرح کی خامیاں ان ناولوں میں نظر آتی ہیں۔

نذیر احمد کا یہ کارنامہ کچھ کم نہیں کہ خیالی اور فوق فطری دنیا سے دامن چھڑا کے اصلی دنیا اور حقیقی زندگی کی تصویر کشی کی۔ اپنے ناولوں میں جا بجا مسلم معاشرت کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کر دیے۔ پلاٹ کی طرف وہ بہت خاص توجہ دیتے ہیں جس کے سبب ان کے ناولوں کے پلاٹ بہت مربوط ہیں۔ کردار نگاری میں بھی انھیں مہارت حاصل ہے۔ مرزا ظاہر دار بیگ، کلیم، ہریالی، نعیمہ، مبتلا بہت ترشے ہوئے کردار ہیں۔ وہ اصل زندگی سے کردار چن لیتے ہیں۔ اس لیے یہ بالکل سچے اور جانے پہچانے کردار لگتے ہیں۔ کمی اتنی ہے کہ نذیر احمد کے کردار یا سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں یا سفید رنگ کے۔ مطلب یہ کہ وہ یا تو اچھے ہوتے ہیں یا برے۔ اسی لیے پروفیسر آل احمد سرور نے کہا ہے کہ نذیر احمد کے کردار یا تو شیطان ہوتے ہیں یا پھر فرشتے، انسان نہیں ہوتے۔ دراصل انسان اچھائی برائی دونوں کا مجموعہ ہے۔

نذیر احمد کے مکالمے لاجواب ہوتے ہیں۔ خاص طور پر عورتوں کی زبان سے ادا کرائے گئے مکالمے۔ دہلی میں انھوں نے مسلمان گھروں میں بولی جانے والی زبان کو بہت توجہ سے سنا تھا۔ وہ ایک زبردست عالم تھے اور زبان پر یوں بھی انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔

یہ ناول اصلاحی مقصد کے لیے لکھے گئے۔ یہ اصلاحی مقصد نذیر احمد کے فن کو اکثر نقصان پہنچاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ "جب ان کا فن جاگتا ہے تو مقصد سو جاتا ہے اور جب مقصد بیدار ہوتا ہے تو فن کو نیند آجاتی ہے۔ وہ فن اور مقصد کے درمیان توازن برقرار نہیں رکھ سکے۔ فن کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہا تو مقصد کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور جب جب مقصد کی طرف توجہ کی تو فن کے تقاضے پورے نہ کر سکے۔" درسِ اخلاق کو ان کے یہاں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

نذیر احمد کی تصانیف بہرحال ایک جدید نثری صنف کا سنگ بنیاد ہیں۔

رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ نام، سرشار تخلص۔ ایک کشمیری برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ قریب ۱۸۴۷ء۔ ۱۹۰۲ء کیننگ کالج لکھنؤ میں نویں درجے تک تعلیم حاصل کی۔ پھر ایک اسکول میں مدرس ہو گئے۔ اسی زمانے میں مضمون لکھنے شروع کیے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ یہاں سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ ۱۸۷۸ء کے لگ بھگ "اودھ اخبار" کے مدیر مقرر ہوئے۔ اسی اخبار میں انھوں نے اپنا ناول "فسانۂ آزاد" قسط وار شائع کیا۔ اس کے بعد "فسانۂ جدید" کے نام سے دوسرا ناول شروع کیا جو بعد کو "جامِ سرشار" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کرسار بھی اسی زمانے (۱۸۹۰ء) میں چھپا۔

www.urduchannel.in

کچھ دنوں بعد سرشار" اودھ پنچ" سے الگ ہوگئے۔ اس زمانے میں ان کے ایک قدردان سی بی گھوش نے ان کی سرپرستی کی اور ان کے لیے "خم کدۂ سرشار" کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ اس کے ہر پندرہ روزہ شمارے میں سو صفحات کا سرشار کا ایک ناول شائع ہوتا تھا۔ اس کے لیے سرشار نے پانچ ناول لکھے۔ ۱۸۹۵ء میں سرشار حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں ان کی قدر تو بہت ہوئی مگر کثرت سے مے نوشی کرنے لگے۔ وہاں انھوں نے دبدبۂ آصفی کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ وہیں ۱۹۰۲ء میں وفات پائی۔

❊ ❊ ❊

سرشار ایک زود رقم مصنف تھے۔ انھوں نے مضمون لکھے، ترجمے کیے اور متعدد ناول لکھے۔ ان میں سے اہم ہیں فسانۂ آزاد، جام سرشار، سیر کہسار، کامنی، بچھڑی دلہن، پی کہاں اور کڑم دھڑم۔ لیکن جس تصنیف نے انھیں اردو ادب میں امر کر دیا وہ "فسانۂ آزاد" ہے۔

سرشار ہمیشہ سے ایک لاپروا اور لاابالی قسم کے انسان تھے اسی لیے تعلیم بھی پوری نہ ہوسکی۔ وہ جم کر کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ حد سے زیادہ پینے لگے۔ اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ مطالعہ تو کوئی خاص نہ تھا لیکن لکھنؤ اور لکھنؤ کی معاشرت کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا۔ اس کے گہرے رازدار تھے۔ نول کشور کے یہاں ملازمت کی اور اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو لکھنؤ کی تہذیب پر قسط وار مضامین لکھے۔ بعد کو انھیں ایک لڑی میں پرو کر ناول کی شکل دے دی۔ یہی ناول فسانۂ آزاد ہے اور اسی لیے اس کا پلاٹ بہت ڈھیلا ڈھالا ہے۔ ناول کی قسطیں وہ قلم برداشتہ لکھتے رہے اور کبھی اس میں ربط پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔ حالت یہ تھی کہ جب اخبار تقریباً تیار ہو جاتا اور صرف سرشار کے کالم کی جگہ باقی رہ جاتی تو شدت سے ان کی تلاش ہوتی۔ یہ کسی غور و فکر کے بغیر میاں آزاد کے کسی سیر سپاٹے کی روئداد گھسیٹ دیتے اور اکثر تو املا کرا دیتے۔

فسانۂ آزاد تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ چار جلدوں میں ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔

یہ ضخیم کتاب جس ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی گئی شاید اردو ادب میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہ ہو۔ اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز لکھنؤ کی تہذیب کے وہ مٹتے ہوئے نقش ہیں جو اس تصنیف میں ایک بار پھر سے جگمگا اٹھے ہیں۔ منظر نگاری میں وہ مصور کی آنکھ اور شاعر کے دماغ سے کام لیتے ہیں اس لیے ان کی ہر تصویر جاندار ہے۔ لطف یہ کہ آپ پتا نہیں لگا سکتے کہ اس تہذیب سے جس میں خوبیاں کم اور خامیاں زیادہ ہیں وہ ہمدردی رکھتے ہیں یا نفرت۔ ان کا کام تو بس اتنا ہے کہ جہاں کوئی مزے دار تصویر دیکھی اپنا آئینہ اس کے سامنے کر دیا۔

آزاد کے ساتھ خوجی کا کردار بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ ایک نئی تہذیب کا نمایندہ ہے دوسرا پرانی تہذیب کی یادگار ــــ خوشامدی، فریبی، چغل خور اور شیخی خورا مگر بے لاجواب! مکالمہ نگاری میں سرشار لاثانی ہیں۔ وہ موقعے کی مناسبت سے ایسے مکالمے تخلیق کرتے ہیں جو لطف دے جاتے ہیں۔ زبان پر بھی انھیں مکمل قدرت حاصل ہے۔

پروفیسر گیان چند جین نے "فسانۂ آزاد" کو اس کے پھیلاؤ اور بکھراؤ کے پیش نظر داستان اور ناول کی درمیانی کڑی کہا ہے لیکن اعتراف کیا ہے کہ سرشار نے زندگی کی وسعت اور گہرائی کا احاطہ کرنے کی بنیاد ڈالی اور اردو ناول کو اس کے بالکل ابتدائی دور میں ایک ایسی روایت سے آشنا کیا جسے فنی عظمت کا پیش خیمہ کہنا چاہیے۔ دراصل وہ ناول کی مغربی روایت سے باخبر تھے اور اسے اردو میں رواج دینے میں انھوں نے سہارا دیا۔

سرشار نے "خم کدۂ سرشار" کے لیے جو ناول لکھے انھیں تو نظر انداز کر دینا چاہیے، فسانۂ آزاد کے علاوہ "جام سرشار" اور "سیر کوہسار" البتہ پڑھنے کے لائق ہیں مگر ان کا پلاٹ بھی ڈھیلا ڈھالا ہے۔ اس کے باوجود ان کے ناول دلچسپ ہیں اور اردو ناول کی تاریخ میں اہمیت کے حامل۔

عبدالحلیم شرر

عبدالحلیم نام، شرر تخلص، ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم کا آغاز ہوا لیکن تین سال تک کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ان کے والد

۱۸۶۰ء - ۱۹۲۶ء

www.urduchannel.in

حکیم تفضل حسین بسلسلۂ ملازمت مٹیابرج کلکتہ میں مقیم تھے۔ انھوں نے [illegible] علمی ماحول تھا۔ یہاں انھوں نے عربی فارسی کے ساتھ کچھ انگریزی بھی سیکھی۔ اس کے بعد لکھنؤ واپس آئے اور تحصیل علم کا شغل جاری رکھا۔ ایک بار دہلی کا سفر بھی کیا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام رہا۔ یہاں انھوں نے عبدالوہاب نجدی کے رسالہ "توحید" کا ترجمہ کیا اس طرح ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۸۸۱ء میں شررؔ لکھنؤ واپس آئے اور اودھ اخبار سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے ادبی مضامین اسی اخبار میں چھپتے اور اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کرتے رہے۔ ان کی شاعرانہ نثر ہر طرف مقبول ہوگئی اور اکثر لکھنے والے اس کی پیروی کرنے لگے۔

۱۸۸۷ء میں شررؔ نے اپنا رسالہ "دل گداز" جاری کیا۔ ان کے ناول ملک العزیز ورجینا، حسن انجلینا، منصور موہنا قسط وار اس میں شائع ہوتے رہے۔ یہ رسالہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکا اور مالی دشواریوں میں گرفتار رہا۔ رسالہ جاری کرنے کے چوتھے سال مالی آسودگی کی تلاش میں شرر حیدرآباد پھر ایک رئیس زادے کے ساتھ انگلستان چلے گئے۔ یہاں قیام کے دوران انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی۔ وہاں سے واپس حیدرآباد آئے تو وہیں سے دوبارہ رسالہ دل گداز جاری کیا۔ حیدرآباد میں انھوں نے ایک ایسی کتاب لکھی جو کچھ مسلمانوں کے لیے برہمی کا باعث ہوئی۔ آخر نظام نے انھیں ملک بدر کر دیا اور وہ مستقل طور پر لکھنؤ چلے آئے۔ ۱۹۲۶ء میں شررؔ نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔

❖ ❖ ❖

مولانا عبدالحلیم شررؔ نے چھیاسٹھ برس کی عمر پائی لیکن بہت زیادہ لکھا۔ انھوں نے سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ان میں زیادہ تر ناول ہیں۔ مضامین کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے نو ہفت روزہ اور ماہانہ پرچے جاری کیے۔ انھوں نے کچھ ترجمے بھی کیے جن میں بنکم چندر چٹرجی کا ناول "درگیش نندنی" اہم ہے۔ مولانا کے مشہور ناول ہیں: فردوسِ بریں، ملک العزیز ورجنا، فلورا فلورنڈا، منصور موہنا، حسن کا ڈاکو، زوالِ بغداد۔

مولانا شررؔ نے اپنے ناولوں کے ذریعے تاریخ اسلام کو زندہ کیا۔ اسلامی شان و شوکت کے قصے سنائے اور مسلمانوں کو اپنے بزرگوں کے کارناموں پر فخر کرنے کا موقع دیا لیکن ان کے زیادہ تر ناول فن کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ ان ناولوں کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ سب میں عموماً ایک سے قصے، ایک سے واقعات اور ایک سے کردار نظر آتے ہیں۔ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے۔

آج شررؔ کے ناولوں کو لوگ بھول چکے ہیں لیکن جس زمانے میں وہ شائع ہوئے اس زمانے میں انھیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لوگ ان کے تازہ ناول کا انتظار کرتے تھے۔ جو لوگ ناول کے فنی تقاضوں سے ناواقف ہیں وہ آج بھی ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن شررؔ کے زمانے میں تو لوگ انھیں پڑھ کر جھوم جھوم جایا کرتے تھے۔

شررؔ کا اندازِ بیان شاعرانہ ہے۔ اس زمانے میں یہ مقبول تھا لیکن آج کے دور میں پسند نہیں کیا جاتا۔ انھیں اعلیٰ درجے کا ناول نگار نہیں کہا جا سکتا۔

منشی سجاد حسین

۱۸۵۶ء - 1915ء

سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں کاکوری (لکھنؤ) کے ایک آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ بعد کو حیدرآباد میں سول جج بھی رہے۔ سجاد حسین نے انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں کیننگ کالج لکھنؤ میں انٹرمیجیٹ کلاس کی تعلیم بھی پائی مگر امتحان پاس نہ کر سکے۔ فکرِ معاش دامن گیر ہوئی تو فوجیوں کو اردو پڑھانے کی ذمہ داری قبول کرلی۔ آخر اس سے بھی کنارہ کش ہوگئے اور ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" اخبار جاری کر دیا۔ اس کے پورے دس سال بعد وہ کانگریس میں شریک ہوگئے اور آخر تک اس کے ہمنوا رہے۔ ۱۹۰۱ء میں فالج کا حملہ ہوا مگر جانبر ہوگئے۔ چوتھے سال فالج کا دوسرا حملہ ہوا۔ عرصۂ دراز تک بیمار رہے۔ ۱۹۱۵ء میں وفات ہوئی۔

www.urduchannel.in

اودھ پنچ ـــــ منشی سجاد حسین نے ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" جاری کیا اڈیٹر کی ذمہ داری خود سنبھالی۔ اخبار کے طنزیہ اور ظریفانہ انداز نے دیکھتے ہی دیکھتے اسے سارے ہندوستان میں مقبولِ خاص و عام بنا دیا۔ اس مقبولیت کا راز یہ ہے کہ اسے شروع ہی سے بڑے جادو نگار مصنف نصیب ہوئے۔ ان میں سے جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان کے نام ہیں: پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، اکبر الہ آبادی، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی، منشی احمد علی شوق، پنڈت رتن ناتھ سرشار، برج نراین چکبست۔ اہلِ قلم کا اتنا بڑا حلقہ شاید ہی کسی اخبار یا رسالے کو میسر آیا ہو۔ پھر ان میں سے ہر ایک بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مالک تھا۔

"اودھ پنچ" بڑا بے باک اخبار تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی راج تشدد پر آمادہ تھا اور ہندوستان کی دولت لوٹ کھسوٹ کے انگلستان لے جانا چاہتا تھا۔ اودھ پنچ نے حکومت کی اس پالیسی کو طنز کا نشانہ بنایا اور ہنسی ہنسی میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو سنجیدگی کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

یہ اخبار کانگریس اور تحریکِ آزادی کا حامی تھا مگر سیاست میں بھی وہ ظرافت کو کام میں لاتا تھا اور تحریک کے مخالفوں پر طنز کرتا تھا۔

ادب کے معاملے میں اخبار کی پالیسی میں کسی قدر شدت تھی۔ چنانچہ جب مولانا حالی نے نیچرل شاعری اور نظم نگاری کی وکالت کی اور غزل کو بے وقت کی راگنی کہا تو اودھ پنچ ان کے مقابلے پر آگیا اور بہت سخت رویہ اختیار کیا۔

اخبار کی زبان نہایت شائستہ اور صاف ستھری ہوتی تھی۔ پھکڑ پن اور بیہودہ گوئی سے اس نے ہمیشہ اپنا دامن بچایا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سنجیدہ اور متین ظرافت کو فروغ دیا۔ اس سے اردو ادب کا دامن وسیع ہوا اور اس کے طفیل اعلیٰ درجے کی طنز و ظرافت کا سرمایہ فراہم ہوگیا۔

منشی سجاد حسین کا ادبی کارنامہ ـــــ منشی سجاد حسین نے "اودھ پنچ" جاری کر کے اردو ادب میں اعلیٰ درجے کی ظرافت کی بنیاد ڈالی۔ نامور اہلِ قلم کو یکجا کیا اور خود بھی ظریفانہ ادب کی قلمی خدمت انجام دی۔ انھوں نے بہت سے مضامین اور متعدد ناول لکھے۔ ان میں حاجی بغلول، کایا پلٹ اور احمق الذی اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئے۔ ان ناولوں کے ذریعے حاجی بغلول اور احمق الذی جیسے دلچسپ کردار اردو ادب کو میسر آئے۔

سجاد حسین ایک صاف گو، نڈر، نیک سیرت اور عالی ظرف انسان تھے۔ بغض، کینہ، مصلحت اندیشی جیسی چیزوں سے وہ ناواقف تھے۔ طنز و ظرافت کو بعض مصنف اپنے حریفوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے آئے ہیں مگر سجاد حسین ایک با اصول انسان تھے۔ ذاتی منفعت کے لیے انھوں نے کبھی اپنے اخبار کو استعمال نہیں کیا۔

سجاد حسین کی زبان نہایت صاف ستھری اور شائستہ ہے۔ عامیانہ الفاظ کے استعمال سے وہ ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ روزمرہ اور محاورے کا خیال رکھتے ہیں۔ استعارہ و تشبیہ کو انھوں نے بہت سلیقے کے ساتھ برتا ہے۔

اردو طنز و ظرافت کی تاریخ میں سجاد حسین کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

مرزا محمد ہادی رسوا

۱۸۵۸ء - ۱۹۳۱ء

مرزا محمد ہادی نام، رسوا تخلص۔ ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد مازندران سے ہندوستان آئے۔ پہلے دلی میں قیام رہا پھر مستقل قیام کے لیے نظرِ انتخاب لکھنؤ پر پڑی۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ فارسی کے علاوہ ریاضی، اقلیدس اور نجوم ان کے والد کے پسندیدہ مضامین تھے۔ بعد میں انگریزی اور عربی بھی پڑھی۔ ابھی سولہ برس کے تھے کہ ماں باپ دونوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ عزیزوں نے تربیت کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ جائیداد بھی دبالی۔

www.urduchannel.in

تعلیم کا سلسلہ انھوں نے بہرحال جاری رکھا۔ انٹرتس پرائیویٹ کرنے کے بعد رڑکی سے انجینیرنگ کا امتحان پاس کیا۔ پھر ریلوے میں ملازمت کر لی۔ ملازمت کے دوران اچانک انھیں کیمسٹری سے دلچسپی ہوگئی۔ ملازمت ترک کر دی اور گھر کا سامان فروخت کرکے ولایت سے کیمسٹری کے آلات منگوالیے۔ خرچ پورا کرنے کے لئے مجبوراً ایک اسکول میں فارسی پڑھانے کی نوکری کرنی پڑی۔ ایک لوہار کے بیٹے کو اس شرط پر ٹیوشن پڑھاتے تھے کہ اس کے عوض بھٹی استعمال کرنے کی آزادی ہو۔ ان مشاغل کے باوجود پرائیویٹ طور پر پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کی اور امریکہ کی اورنٹیل یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔

مرزا محمد ہادی نے اپنے شوق اور اپنی محنت سے بہت سی زبانیں سیکھیں اور بہت سے مشکل علوم پر دسترس حاصل کی۔ اس کے باوجود ان کے مزاج میں تکبر نہیں تھا۔ بہت سادہ درویشانہ زندگی گذارتے تھے۔ جو کمرہ ان کے استعمال میں رہتا تھا وہ ہر قسم کی آرایش سے بے نیاز تھا۔ کمرے کے ایک حصے میں چٹائی بچھی رہتی تھی۔ اس کے ارد گرد کاغذوں اور کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ اس ساز و سامان کے علاوہ کمرے میں دو چیزیں اور ہوتی تھیں۔ ایک حقہ اور ایک انگیٹھی۔

مرزا نے ۱۹۳۱ء میں وفات پائی۔

* * *

مرزا شاعر بھی تھے اور ناول نگار بھی۔ ان کی شاعری میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ لوگ اسے یاد رکھتے۔ البتہ ناول نگار کی حیثیت سے ان کا نام اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انھوں نے چھ ناول لکھے ان میں سے کئی تو ایسے ہیں جو ان کی لاپروا طبیعت کا نمونہ ہیں۔ یہ ان کی زندگی ہی میں گوشۂ گمنامی میں جا چھپے تھے۔ صرف تین ناول یاد رکھے گئے۔ ایک "شریف زادہ" جس کے بارے میں خیال ہے کہ ان کی اپنی آپ بیتی

ہے۔ "ذات شریف" اودھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہاں کے اعلیٰ طبقے کے خاندان جن مصائب کا شکار ہوئے ان کی کہانی ہے۔ یہ دونوں ناول اس لیے زندہ رہیں گے کہ مرزا محمد ہادی رسوا کی تخلیق ہیں۔ لیکن مرزا صاحب زندہ رہیں گے تو اس لیے کہ انھوں نے "امراؤ جان ادا" جیسا ناول تخلیق کیا۔

"امراؤ جان ادا" اردو کا لازوال اور شاہکار ناول ہے۔ یہ ایک لڑکی کی داستان ہے جو ایک قصبے سے اغوا کرکے لکھنؤ کے ایک کوٹھے پر طوائف کے ہاتھ بیچ دی گئی۔ اس نے ساری زندگی طوائفوں کے درمیان ایک طوائف کی حیثیت سے گزاری مگر اس جال سے نکلنے کے لیے ہمیشہ ہاتھ پیر مارتی رہی۔ اس کی زندگی عجب کشمکش میں گزری۔ مگر طوائف کی زندگی پیش کرنا ناول کا اصل مدعا نہیں۔ لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب، اس زمانے کا رہن سہن، اس عہد کے حالات ـــــ ان سب چیزوں کو وہ اپنے کیمرے میں قید کر لینا چاہتے تھے۔ اس کام کے لیے ایک اسٹیج درکار تھا جہاں باری باری سب کو بلائیں اور کیمرے کا بٹن دباتے جائیں۔ آخر ان کی نظر انتخاب طوائف کے کوٹھے پر پڑی جو ایک ایسا مقام تھا جہاں سے ہر کوئی کبھی نہ کبھی ضرور گزرتا تھا۔ بڑھے نواب جن کے منھ میں دانت اور پیٹ میں آنت نہیں، ان کے ہونہار سپوت فیضو جیسے ڈاکو، اپنے علاقے کے محافظ راجہ صاحب، خاں صاحب جیسے شورہ پشت، گوہر مرزا جیسے شہدے اور حد یہ ہے کہ وہ مولوی صاحب جنھیں بسم اللہ نیم کے پیڑ پر چڑھا دیتی ہے۔ جو اس کوٹھے تک نہیں پہنچ سکتا فنکار کا جادو نگار قلم کوٹھے کو اس تک پہنچا دیتا ہے۔ عرس، میلے، بسم اللہ کی رسمیں، کھلا کوٹھے پر کیسے چڑھیں۔ طوائف سیر کے لیے یا پھر مجرا کرنے کے لیے وہاں پہنچ جاتی ہے۔ پناہ لینے کے لیے مسجد میں جا پہنچتی ہے۔ بے روزگار فاقہ زدہ لوگوں کو دکھانا مقصود ہے تو مصنف انھیں ڈاکوؤں کی ٹولی کی شکل میں شہر سے باہر مرزا سلطان کی حویلی میں ڈاکہ ڈالنے لے جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ طوائف کے کوٹھے کو مرکزی مقام بنا کر فن کار نے لکھنؤ اور اردگرد کی مکمل زندگی کی ہو بہو تصویر کھینچ دی

www.urduchannel.in

ہے۔

یہ سوال ہمارے دماغ کی طرح بار بار آپ کے دماغ کو بھی پریشان کرتا ہوگا کہ امراؤ جان واقعی کوئی طوائف تھی؟ کیا یہ سارے واقعات بالکل سچے ہیں؟ اصلیت یہ ہے کہ جس زمانے کا یہ قصہ ہے اس زمانے میں امراؤ جان نام کی کوئی طوائف نہیں ہوئی، بہت پہلے ہوئی ہے۔ یہ غدر کے زمانے کا قصہ ہے۔ مصنف نے انگریزی فوجوں کو شہر میں داخل ہوتے، اہلِ لکھنؤ کو جان بچاکر بھاگتے اور خود امراؤ جان کو دربدر ہوتے دکھایا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس وقت امراؤ جان کچھ نہیں تو پینتیس چالیس کی ضرور ہوں گی۔ ناول کے مصنف مرزا محمد ہادی غدر کے ایک سال بعد پیدا ہوئے۔ گویا جو رسوا صاحب امراؤ جان سے کرید کرید کر ماضی کے حالات پوچھتے ہیں وہ مرزا محمد ہادی نہیں ہوسکتے۔ اس طرح ثابت ہوجاتا ہے کہ رسوا کا کردار مصنف کا گھڑا ہوا ہے۔

یہ بہرحال درست ہے کہ ناول کا ہر واقعہ اور ہر کردار بالکل سچا اور بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ ناول چھپا تو پڑھنے والوں کو امراؤ جان کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ لوگ لکھنؤ میں ان کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے۔ جس نے پڑھا اس نے قصے کو اصلی جانا۔ خود مرزا محمد ہادی یہی کہنے لگے کہ یہ سچا قصہ ہے جو میں نے خود امراؤ جان سے سنا اور جی ہاں رسوا میں خود ہی ہوں۔ اس لیے ہم نے بھی ان کا پورا نام مع تخلص مرزا محمد ہادی رسوا تسلیم کرلیا حالانکہ ان کا تخلص ہادی تھا۔

ناول کا پلاٹ نہایت مربوط اور بہت گٹھا ہوا ہے۔ پلاٹ دوہرا ہے۔ ایک کہانی امیرن کی ہے اور دوسری رام دئی کی۔ دونوں کی ابتدائی زندگی ایک ساتھ شروع ہوتی ہے۔ پھر بچھڑ جاتی ہیں اور آخر میں زندگی کے ایک نازک موڑ پر پھر ملتی ہیں۔ فن کار نے دونوں کہانیوں میں غضب کا پیوند لگایا ہے۔ پلاٹ کو قابو میں رکھنے کے لیے مصنف نے رسوا نام کا ایک کردار وضع کیا جو امراؤ جان سے اس کے حالات سن کر ہمیں سناتا ہے۔ جو کچھ بتانا ایک عورت کے لیے مشکل ہے اسے وہ کرید کرید کر پوچھتا ہے اور جو کچھ غیر ضروری ہے اسے چھوڑ کر

اگلا سوال کرتا ہے۔ اس طرح پلاٹ قابو میں رہتا ہے۔

کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے بھی یہ ناول لاجواب ہے۔ بعض کردار بڑے ہیں، جو ناول میں دور تک پھیلے ہوئے ہیں مثلاً خود امراؤ جان، خانم، گوہر مرزا، بسم اللہ جان، خورشید جان، مرزا سلطان وغیرہ۔ بعض سے ہماری ملاقات بس ذرا سی دیر کو ہوتی ہے جیسے خاں صاحب، مولوی صا۔۔ب نیفو وغیرہ۔ کامیاب مصور دو تین برش مار کر جاندار تصویر بنا دیتا ہے۔ یہ چھوٹے کردار ایسی ہی تصویریں ہیں۔ یہ ناول کردار نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

یہ قصہ اس زمانے کا ہے جب لکھنؤ میں ہر طرف شعر و ادب کا ماحول تھا اور طوائف کے کوٹھے کو تو اس وقت ادب اور تہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ناول کی زبان ادبی ہے۔ شعروں کا برمحل استعمال ہے۔ مکالمے بھی ترشے ہوئے ہیں۔

غرض "امراؤ جان ادا" کو معجزۂ فن کہا جائے تو بے جا نہیں۔

راشد الخیری

۱۸۶۸ء۔۱۹۳۶ء

نام تو محمد عبدالراشد تھا مگر راشد الخیری کے نام سے شہرت پائی۔ مولوی خیر اللہ نام کے ایک نیک پرہیزگار بزرگ ان کے خاندان میں گزرے تھے۔ برکت کے خیال سے ان کا نام اپنے نام کے ساتھ جوڑ کر ۱۹۰۶ء سے وہ اپنا نام راشد الخیری لکھنے لگے۔

عبدالراشد ۱۸۶۸ء میں دہلی کے ایک عالم اور مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ سن تمیز کو پہنچے تو پڑھنے بٹھایا گیا مگر طبیعت اس طرف راغب نہ ہوسکی۔ ان کا دل لگتا تھا کھیل کود، کشتی، کبڈی اور پتنگ بازی میں۔ گھر والے مایوس تھے کہ لڑکا نکما ہے، کچھ نہ کرسکے گا۔ مگر قسمت اچھی تھی۔ اسی زمانے میں ان کے پھوپھا مولوی نذیر احمد حیدرآباد سے دہلی آئے۔ عبدالراشد ان کے سپرد کردیے گئے۔ مولوی صاحب بلا کے ذہین اور مردم شناس تھے۔ انھوں نے اپنی باتوں سے، پڑھانے کے دلچسپ طریقے سے ایک بچے کے دل میں علم کا ایسا شوق پیدا کردیا کہ اب علم کے سوا کسی اور طرف طبیعت مائل ہی نہ ہوتی تھی۔ تعلیم سے

www.urduchannel.in

فارغ ہو کر ملازمت کرنی چاہی مگر اس میں دل نہ لگا۔ آخر ملازمت ترک کر کے باقی زندگی کو علم و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

اپنے زمانے کے مشہور رسالہ "مخزن" کے لیے انھوں نے مضامین لکھنے شروع کیے۔ یہیں سے ان کی علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ بعد کو وہ اس کے مدیر ہو گئے۔ خود بھی انھوں نے کئی رسالے نکالے مثلاً عصمت، تمدن اور سہیلی جاری کیے۔ ان میں عصمت نے بہت شہرت پائی۔ راشد الخیری نے نثر کے علاوہ شاعری کی طرف بھی توجہ کی مگر یہ ان کا اصل میدان نہیں تھا۔ ان کا اصل میدان ہے خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے اصلاحی ناول۔

شاید یہ مولوی نذیر احمد کی تربیت کا اثر تھا کہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کی طرف طبیعت مائل تھی اور بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح عورتوں کی سماجی حالت سدھرے اور وہ سر اٹھا کر جینے کے قابل ہو جائیں۔ راشد الخیری نے بچپن میں یتیمی کا داغ کھایا تھا جس سے حزن و ملال ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ جب انھوں نے متوسط مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں اور عورتوں کی خراب و خستہ حالت دیکھی تو ان کا دل رو اٹھا۔ اپنے ناولوں میں عورتوں کی خستہ حالی کا ذکر انھوں نے ایسی ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ کیا کہ "مصورِ غم" کا لقب پایا۔

مولانا راشد الخیری قدامت پسند تھے۔ نئی تہذیب میں انھیں بہت خرابیاں نظر آتی تھیں۔ اپنی تحریروں کے ذریعے وہ عورتوں کو ان خرابیوں سے خبردار کرتے رہتے تھے، اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتے تھے اور ایسی تدبیریں بتاتے تھے جن سے عورتوں کی زندگی جنت کا نمونہ بن سکے۔ ان کا ایک خاص موضوع یہ بھی ہے کہ عورتیں کس طرح اپنے بچوں کی صحیح تربیت کریں۔

کم و بیش اسّی تصانیف مولانا سے یادگار ہیں۔ ان میں سے اہم ہیں: سمرنا کا چاند، صبحِ زندگی، شامِ زندگی، شبِ زندگی، ماہ مجم، آمنہ کا لال، سیدہ کا لال، دلّی کی آخری بہار، مجبورِ خداوند، عروسِ کربلا، نوبت پنج روزہ اور منازل السائرہ۔

مولانا کا روئے سخن عام طور پر طبقۂ نسواں کی طرف ہے، اس لیے وہ سادہ، سہل اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے جملے مختصر ہونے کے ساتھ دلکش و پر اثر بھی ہوتے ہیں۔ برمحل محاورے استعمال کرتے ہیں مگر اس طرح کہ ان کا استعمال بالکل فطری معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نہیں لگتا کہ سوچ سوچ کے محاورے لا رہے ہیں، بلکہ ایسا لگتا ہے آپ سے آپ موقع کی مناسبت سے یاد آ گئے ہیں۔ دہلی کی ٹکسالی زبان اور خاص طور پر متوسط گھرانوں کی عورتوں کی بول چال پر انھیں مکمل عبور حاصل ہے۔ ان کے ناولوں کی مقبولیت میں اس خصوصیت کا بڑا حصہ ہے۔

۱۹۳۶ء میں مولانا راشد الخیری نے دہلی میں وفات پائی۔

پریم چند

۱۸۸۰ء - ۱۹۳۶ء

اصل نام دھنپت رائے تھا مگر قلمی نام پہلے نواب رائے پھر پریم چند رکھا۔ آج دنیائے ادب انھیں اسی نام سے جانتی ہے۔ ان کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ دھنپت رائے ۱۸۸۰ء میں بنارس کے قریب ایک گاؤں لمہی پانڈے پور میں پیدا ہوئے۔ بچپن بہت تنگدستی میں گزرا۔ آٹھ برس فارسی پڑھنے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی۔ دسویں جماعت کا امتحان بمشکل پاس کیا۔ حساب میں بالکل کورے تھے۔ مالی حالت بھی خراب تھی اس لیے تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ کچھ عرصہ بعد پرائیویٹ طور پر بی۔ اے۔ پاس کر لیا۔ بمشکل بیس برس کے تھے کہ ایک اسکول میں مدرس ہو گئے۔ مدرسی کی ٹریننگ لینے کے بعد ایک ٹریننگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ ترقی کر کے مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ مہاتما گاندھی کے خیالات سے وہ بہت متاثر تھے۔ عدم تعاون کی تحریک کے دوران انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ پھر ایک کے بعد ایک کئی اخبار نکالے مگر کوئی اخبار ان کے خرچ کو پورا نہ کر سکا۔

افسانوی ادب سے کم عمری سے ہی دلچسپی تھی اور ایک مدت سے افسانے لکھ رہے تھے۔ یہ افسانے مقبول تھے اور رسالے ملک میں پڑھے جاتے تھے۔ شاید اسی کو دیکھتے ہوئے

www.urduchannel.in

بمبئی کی ایک فلم کمپنی نے ان کی خدمات حاصل کرلیں۔ فلمی دنیا میں جس قسم کی کہانیاں درکار تھیں پریم چند کو دیسی کہانیاں لکھنی پسند نہ تھیں۔ آخر بمبئی سے لوٹ آئے۔ یہ واقعہ ۱۹۳۵ء کا ہے۔ واپس آکر چھاپہ خانہ لگایا۔ ایک رسالہ "ہنس" نکالا۔ باقی زندگی انھوں نے افسانہ اور ناول کی خدمت میں گزار دی۔ ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

⁂

ہماری زبان میں ناول پریم چند سے پہلے بھی موجود تھا اور "امراؤ جان ادا" جیسا فنی معجزہ بھی ظہور میں آچکا تھا لیکن پریم چند نے اسے نئی جہتوں سے آشنا کیا اور ہم رتبۂ آسماں کر دیا۔ ان کی انگلیوں کے لمس سے اردو ناول میں پہلی بار پورے ہندوستان کا دل دھڑک اٹھا۔

پریم چند کے عہد کا ہندوستان بے شمار مسائل میں گھرا ہوا تھا۔ انگریزی حکومت کی پالیسی نے ملک کی اقتصادی حالت کو برباد کر دیا تھا۔ انگریزوں کی ساری توجہ ملک کی دولت لوٹ کر اپنے وطن لے جانے کی رہی۔ انھوں نے نہیں چاہا کہ ہندوستان میں صنعت و حرفت کی ترقی ہو۔ ہندوستان ایک دیہی ملک ہے اور دیہات کی حالت شہروں سے زیادہ ابتر تھی۔ دیہات کو برباد کرنے والے غیروں سے زیادہ اپنے تھے۔ زمیندار، مہاجن اور مہنت کسانوں اور مزدوروں کو لوٹے ڈالتے تھے۔ پریم چند نے ان کے مسائل کو ناول و افسانے کا موضوع بنایا۔

ہندو مسلم نفاق بھی ہندوستان کا ایک پیچیدہ مسئلہ تھا اور انگریز اسے خوب ہوا دیتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ تحریک آزادی کو نقصان پہنچے۔ پریم چند ملک کی آزادی کے خواہاں اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے ان مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔

ملک کے ایک بڑے طبقے کو اچھوت کہہ کر اس کے ساتھ طرح طرح کی زیادتیاں کی جاتی تھیں۔ پریم چند کی تخلیقات میں اس صورتِ حال کے خلاف بغاوت نظر آتی ہے۔ ہندو

سماج کو وہ خرابیوں سے پاک کرنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں اور وہ اسے سربلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ خود ہندو ہونے کے سبب ہندو قوم کے مسائل سے انھیں گہری واقفیت ہے۔ جس طبقے کو جو عیب گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے اسے وہ خوب سمجھتے ہیں اور اس سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں ہندوستانی عوام کی بھیڑ نظر آتی ہے۔ ہر طرف وہ لوگ ہیں جنھیں ہم دن رات دیکھتے ہیں اور صبح و شام برتتے ہیں۔ انسانی نفسیات سے وہ پوری آگہی رکھتے ہیں اس لیے کردار نگاری میں انھیں بڑی مہارت حاصل ہے۔

پریم چند کی زبان صنع اور بناوٹ سے یکسر پاک ہے۔ تصنیفی زندگی کے ابتدائی حصے میں عربی فارسی الفاظ کی کثرت نظر آتی ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ اس راستے سے ہٹتے جاتے ہیں اور آخر کار سادہ اور فطری زبان ان کی گرفت میں آجاتی ہے جس میں سادگی کے باوجود ہزار بناؤ ہیں اور جس کی دلکشی بے پناہ ہے۔ ان کے ناول "میدانِ عمل" اور "گئودان" اس کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کے مکالمے بڑے برجستہ اور پر اثر ہوتے ہیں۔

حقیقت نگاری پریم چند کے ناول و افسانہ کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ وہ زندگی کی سچائی کو واضح اور موثر زبان میں پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے دیکھیے تو پریم چند کے ناول ہمارے ادب کا انمول ذخیرہ ہیں۔ فن کی کسوٹی پر پرکھیے تو پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ، منظر کشی ہر اعتبار سے ان کے ناول لاجواب ہیں۔

پریم چند اردو کے عظیم ترین ناول نگار بھی ہیں اور جدید اردو ناول کے بنیاد گزار بھی۔ ان کے خاص ناول ہیں جلوۂ ایثار، بیوہ، بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، غبن، چوگانِ ہستی، پردۂ مجاز، میدانِ عمل اور گئودان۔ جلوۂ ایثار اور بیوہ دورِ اوّل کی یادگار ہیں جب

www.urduchannel.in

ان کے فن میں پختگی نہیں آئی تھی۔ بازارِ حسن، گوشۂ عافیت اور غبن دوسرے دور کے ناول ہیں۔ بازارِ حسن میں شہری زندگی کے مسائل پیش ہوئے ہیں اور عصمت فروشی کو ملامت کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ ایک اصلاحی ناول ہے اس لیے طوائفوں کو آخر میں گناہ سے توبہ کرتے دکھایا ہے۔ گوشۂ عافیت فنی نقطۂ نظر سے کامیاب ناول ہے اور محنت کشوں کے مسائل سے متعلق ہے۔ غبن ایک معاشرتی ناول ہے جس میں متوسط گھرانوں کے بناؤ سنگھار اور گہنوں کے شوق کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

"چوگانِ ہستی" کو پریم چند نے اپنا بہترین ناول کہا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ "گئودان" کو چھوڑ کر ان کے باقی تمام ناولوں کی بہ نسبت یہ زیادہ فنکارانہ ہے۔ اس عہد کے ملکی مسائل کامیابی کے ساتھ اس میں پیش ہوئے ہیں۔ اس کا ہیرو سورداس گاندھی وادی ہے اور اہنسا سے ظلم کا مقابلہ کرتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ آخری فتح سچائی کی ہی ہوگی۔ پردۂ مجاز فنی اعتبار سے کمزور ہے۔ "میدانِ عمل" ایک کامیاب ناول ہے اور اس زمانے میں لکھا گیا جب پریم چند کو نہ مہاتما گاندھی پر بھروسا رہا تھا نہ بھگوان پر وشواس۔ کسی چیز پر اعتماد تھا تو وہ تھا عمل۔ اس ناول کا مرکزی کردار امرکانت خدمت کے جذبے سے سرشار ہے اور اچھوتوں کی بستی کو اپنے عمل کا میدان بنا لیتا ہے۔

"گئودان" پریم چند کا آخری ناول ہے جو فنی تکمیل کا بہترین نمونہ ہے۔ ناول ایک غریب کسان کی اس خواہش کے گرد گھومتا ہے کہ اس کے دروازے پر گائے بندھی ہو۔ یہ خواہش بس ذرا سی دیر کو پوری ہوتی ہے۔ پھر ساری زندگی اسے مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہوری، گوبر اور دھنیا اس ناول کے اہم کردار ہیں جو اردو ناول کی تاریخ میں بھی امر ہو گئے ہیں۔

⁂

پریم چند نے ایک عام ہندوستانی کو ناول کا ہیرو بنا کر اور زندگی کی کھردری حقیقتوں

کو پیش کر کے اردو ناول کو جو سمت عطا کی اس پر سفر جاری رہا۔ مغرب سے کسبِ فیض کا سلسلہ بھی چلتا رہا اور ہمارا ناول نئی وسعتوں سے دوچار ہوا۔ یہاں اختصار کے ساتھ ان مصنفین کا ذکر کیا جاتا ہے جنھوں نے اردو ناول کو یہ وسعتیں عطا کیں۔

قاضی عبدالغفار

وفات ۱۹۵۶ء

قاضی عبدالغفار صحافی بھی تھے اور کئی تحقیقی کتابوں کے مصنف بھی۔ چنانچہ ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا اور زبان پر بھی پوری گرفت حاصل تھی۔ ان کا ناول "لیلیٰ کے خطوط" ایک نئے انداز کا ناول ہے۔ ان کی تکنیک اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہاں بہت سے خطوط مل کر ایک ناول کو جنم دیتے ہیں۔ یہ ایک طوائف کی دردناک کہانی ہے جسے فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تخلیق میں مصنف نے نفسیاتِ انسانی سے گہری واقفیت اور سماجی شعور کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

سجاد ظہیر

۱۹۰۴ء - ۱۹۷۳ء

سجاد ظہیر کا ناول "لندن کی ایک رات" جو ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا اردو ادب میں کئی نئے باب کھولتا ہے۔

سجاد ظہیر کا وطن تو جونپور ہے لیکن تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ قانون کی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ لندن چلے گئے۔ وہاں سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے قیام لندن کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہاں ملک راج آنند اور دوسرے روشن خیال نوجوانوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ان نوجوانوں کی کوشش سے انجمن ترقی پسند مصنفین وجود میں آئی اور اس انجمن نے ہندوستانی ادب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

انگلستان میں قیام کے دوران سجاد ظہیر کو یورپ کے بعض ادبی تجربات سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ ان کے زیرِ اثر "لندن کی ایک رات" وجود میں آیا۔ یہ چند ایسے ہندوستانی نوجوانوں کی کہانی ہے جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن جاتے ہیں۔ وہاں کی زندگی کو دیکھ کر انھیں اپنے ملک کی پسماندگی اور بدحالی کا احساس ہوتا

Lightshot

www.urduchannel.in

ہے۔ انگریزوں سے شدید نفرت اس احساس کا لازمی نتیجہ ہے۔

کرشن چندر

کرشن چندر کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہے مگر ولادت ۱۹۱۲ء میں پنجاب میں ہوئی۔ بچپن کشمیر میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔

۱۹۱۲ء - ۱۹۷۷ء

ایم۔ اے۔ کا امتحان لاہور سے پاس کیا۔ وکالت کی تعلیم بھی حاصل کی اور وکالت شروع کی۔ مگر اس پیشے کو اپنے مزاج کے خلاف پایا تو وکالت ترک کرکے ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ آخرکار اس سے بھی کنارہ کرلیا اور افسانہ نگاری میں مصروف ہوگئے۔ ہر طرف شہرت پھیل گئی۔ یہی شہرت تھی جو دہلی میں ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کا باعث ہوئی۔ آخر اسے بھی چھوڑ دیا اور بمبئی جا بسے۔ وہاں فلموں کے لیے کہانیاں اور مکالمے لکھتے رہے۔ ناول نگاری اور افسانہ نگاری اصل شغل تھا۔ وہ بہرحال جاری رہا۔ ۱۹۷۷ء میں وفات پائی۔

کرشن چندر کا قلم بڑا زرخیز تھا۔ انھوں نے اتنی سے زیادہ کتابیں لکھیں لیکن ہر مصنف کو بسیار نویسی کا تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ ہمیشہ فن کی بلندیوں پر نہیں رہ سکتا۔ کرشن چندر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انھوں نے ان گنت افسانے لکھے۔ ناولوں کی تعداد بھی کم نہیں۔ ان میں سے اہم ہیں: شکست، جب کھیت جاگے، بادل پتے، ایک عورت ہزار دیوانے، آسمان روشن ہے۔ میری یادوں کے چنار، ایک وائلن سمندر کے کنارے، چاندی کے گھاؤ، ایک گدھا نیفا میں، کاغذ کی ناؤ۔

افسانے تو وہ ایک مدت سے لکھ رہے تھے۔ "شکست" لکھ کر انھوں نے ناول کے میدان میں قدم رکھا۔ اس وقت ناول کے پارکھوں نے اس کی قدر و قیمت کے تعین میں ایک دوسرے سے اختلاف رائے کیا۔ پروفیسر احتشام حسین کی رائے ہے کہ کشمیر کی زندگی اور وہاں کے کسانوں کی بیداری کا اس سے جاندار، باشعور اور ہمدردانہ ذکر کہیں اور نہیں ملتا فنی اعتبار سے اس میں خامیاں ہوسکتی ہیں مگر اسے پڑھ کے ایک جیتا جاگتا کشمیر ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔"

کرشن چندر ترقی پسند نظریے کے حامل ہیں اور انسان دوستی ان کی زندگی کا نصب العین ہے۔ یہی دونوں رویے ان کی ہر تخلیق کے پیچھے کارفرما ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس دھوپ چھاؤں سے خوب واقف ہیں جو انسان کو کبھی دکھ دیتی ہے تو کبھی سکھ اور ان ظالمانہ طاقتوں کو بھی خوب پہچانتے ہیں جو اپنے سکھ چین کے لیے دوسروں کی خوشیاں چھین لیتے ہیں۔ ان کے لیے کرشن چندر کے ترکش میں طنز کے زہریلے تیر ہیں اور مظلوموں کے لیے ہمدردی اور رفاقت۔ ان کی تخلیقات ایسے روشن چراغ ہیں جو امن و آشتی اور خوشی و خوش حالی کی راہ دکھاتے ہیں۔

کرشن چندر کے ناولوں کی دلکشی کا ایک راز ان کی رنگین اور شیریں زبان بھی ہے۔ جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ زبان پر ان کی توجہ اس قدر زیادہ رہتی ہے کہ کبھی کبھی موضوع پر گرفت ڈھیلی ہوجاتی ہے۔ ان کے ناولوں میں ایسی مثالیں بھی کم نہیں جب قاری کو حد سے بڑھی ہوئی مٹھاس بے مزہ کردیتی ہے۔ ہمارے عہد کے ناول نگاروں میں کرشن چندر کا نام بڑی عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان کے ناول تو کئی ہیں مثلاً ایک گدھے کی سرگذشت، ایک گدھا نیفا میں، آسمان روشن ہے، سرنے کا سنسار، الٹا درخت، ایک عورت ہزار دیوانے وغیرہ۔ لیکن ان کا سب سے اہم اور مقبول ناول "شکست" (۱۹۴۳ء) ہے۔

عصمت چغتائی

۱۹۱۵ء - ۱۹۹۱ء

عصمت چغتائی کی ولادت ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ بچپن آگرہ اور جے پور میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے لیے علی گڑھ آئیں۔ یہاں انھیں متوسط گھرانوں کی مسلمان لڑکیوں کو نزدیک سے دیکھنے، ان کی آرزوؤں اور امنگوں سے واقف ہونے اور ان کی کمزوریوں کو جاننے کا موقع ملا۔ بمبئی جاکر جب وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہوئیں اور انھیں اپنے

Lightshot

www.urduchannel.in

احساسات و تجربات کو افسانوی ادب کی شکل میں پیش کرنے کا موقع ملا تو معلومات کا یہ ذخیرہ ان کے بہت کام آیا۔ زبان اور طرزِ بیان کو آب بھی اسی علی گڑھ کی فضا سے ملی۔ ۱۹۹۱ء میں ان کی وفات ہوئی۔

ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے عصمت کے افسانہ و ناول کو ایک متعین سمت عطا کی۔ ان کے یہاں جو بیباکی، صاف گوئی اور کاٹ ہے وہ اسی تحریک کی عطائے خاص ہے۔ سرمایہ داروں اور سماج کے ٹھیکیداروں کے لیے ان کے پاس زہر میں بجھے نشتر ہیں۔

عصمت کے افسانوی ادب کا کینوس محدود ہے۔ ان کی ایک جانی پہچانی دنیا ہے۔ متوسط مسلمان گھرانوں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی دنیا۔ وہ اسی دنیا کی سیر کرتی اور اپنے قارئین کو کراتی ہیں۔ مگر ان کا فن اتنا پختہ ہے کہ پڑھنے والے کو مصنفہ کی تنگ دامانی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی محدود دنیا کے ایک ایک گوشے کو بے نقاب کرتی ہیں، اس کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ کرتی ہیں اور اپنی تخلیق کے فنی حسن سے قاری کو موہ لیتی ہیں۔ دراصل انھوں نے زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا اور انسانی نفسیات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ خود ایک جگہ فرماتی ہیں کہ "لکھنے کے لیے میں نے دنیا کی عظیم ترین کتاب یعنی زندگی کو پڑھا ہے اور اسے بے انتہا دلچسپ و موثر پایا ہے۔" اسی لیے مختلف کرداروں کی ذہنی کشمکش اور اندرونی الجھنوں کو انھوں نے بڑی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یہ بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا کہ زندگی کا جو پہلو عصمت کے لیے زیادہ کشش رکھتا ہے وہ جنسی پہلو ہے۔ اس میں بھی جنسی کج روی انھیں خاص طور پر متوجہ کرتی ہے۔ اس لیے ان کا قدم کبھی کبھی فحش نگاری کی دلدل میں جا پھنستا ہے۔ مگر ان کی فنی بصیرت اور فنکارانہ مہارت اس میں بھی حسن پیدا کر دیتی ہے اور آخر کار احساس ہوتا ہے کہ تصویر کا یہ رخ جسے عام طور پر چھپایا جاتا ہے، اگر نہ دکھایا جاتا تو ناول کا حسن مجروح ہو جاتا۔

عصمت چغتائی کی مقبولیت میں ان کی زبان کو بھی بڑا دخل ہے۔ وہ بہت صاف ستھری اور رواں زبان استعمال کرتی ہیں۔ عورتوں کی بول چال کا انھوں نے غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اپنے ناولوں کے مکالموں میں ان سے بہت کام لیا ہے۔ بعض کرداروں کی زبان سے حسب ضرورت وہ ایسے طنزیہ جملے کہلواتی ہیں جو لطف دے جاتے ہیں۔

ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصومہ، سودائی اور اک قطرۂ خوں ان کے ناول ہیں۔ آخری ناول معرکۂ کربلا سے متعلق ہے جس کی واحد خصوصیت پر لطف زبان ہے۔

راجندر سنگھ بیدی

۱۹۱۵ء - ۱۹۸۴ء

راجندر سنگھ بیدی اصلاً افسانہ نگار ہیں اور ان کا ذکر افسانہ نگاری کے باب میں آئے گا مگر انھوں نے ایک ناول بھی لکھا ہے اور وہ بھی مختصر۔ ایک چادر میلی سی، اس کا نام ہے اور یہ بے حد مقبول ہوا ہے۔ دراصل انھوں نے بہت کم لکھا مگر جو کچھ لکھا بے حد انتخاب اور یہ حد درجہ غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنی تحریر کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے تھے۔ ایک لفظ بھی غیر ضروری معلوم ہوا تو قلمزد کیا گیا۔

"ایک چادر میلی سی" میں راجندر سنگھ بیدی کا انداز بے حد اشاراتی ہے۔ رمز نگاری یوں بھی بیدی کی خصوصیت ہے لیکن اس ناول میں وہ کچھ اور بھی نکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ "بادا ہری داس کا لنگوٹ بوسیدہ کپڑے کا نکل آیا تھا۔" جیسے چھوٹے چھوٹے مگر معنی خیز جملے کہہ کر وہ بڑی سے بڑی داستان کو اس میں سمو دیتے ہیں۔ اسی انداز میں اس ناول کے اختصار کا راز پوشیدہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں اور استعاروں کے ذریعے پوری کہانی کہہ جانا بیدی کے اسلوب کی اصل شناخت ہے۔ ان کی نظر کرداروں کے ذہن پر مرکوز رہتی ہے اور تخلیق کے دوران وہ ایک ایک کرکے اپنے کرداروں کے ذہنوں کی گرہوں کو کھولتے جاتے ہیں۔

اس ناول کی کہانی بہت چھوٹی سی اور سیدھی سادی ہے۔ تلوکا جس کا پیشہ یکہ چلانا اور کام چودھری کے لیے بھولی بھٹکی عورتوں کو بٹور کر لانا تھا، ایک روز جاترن کے بھائی کے ہاتھوں

www.urduchannel.in

قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس کی بیوی کی شادی تلوکا کے بھائی منگل سے کر دی جاتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی ایک مختصر سا ناول بغل میں دبائے اردو ناول کی دنیا میں داخل ہوئے مگر ایک دائمی نقش چھوڑ گئے۔

عزیز احمد

۱۹۱۴ء-۱۹۷۸ء

عزیز احمد کے ناول بھی بہت مقبول ہوئے۔ گریز، ایسی بلندی ایسی پستی اور شبنم نے بہت شہرت پائی۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ کئی زبانوں پر عبور ہے اور عالمی ادب سے اچھی واقفیت ہے۔ وہ یورپ کے کئی ناول نگاروں سے متاثر ہیں اور اس فن میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ البتہ ان کی ناول نگاری میں ایک عیب نظر آتا ہے۔ جنسی معاملات ان کے یہاں حاوی ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے زندگی کے باقی مسائل نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر

ولادت ۱۹۲۷ء

جدید اردو ناول کے بنیادگزاروں میں ایک اہم نام اور بعض اعتبار سے سب سے اہم نام قرۃ العین حیدر کا ہے۔ اردو میں مغرب کے اثر سے داستان کی جگہ ناول نے لی تو اس کے موضوعات تھے۔ اصلاحِ معاشرت، تحریک آزادی، غربت، پسماندہ طبقوں، خاص طور پر اس طبقے کے ساتھ جسے اچھوت کا افسوس ناک نام دیا گیا، اظہارِ ہمدردی، عورت کی مظلومی پر احتجاج، اس کے فوراً ہی بعد مغرب اور مغربی تہذیب ناول نگار کی توجہ کا موضوع بنی خواہ اس سے وابستگی کا اظہار کیا گیا ہو یا بیزاری کا۔ لندن کی ایک رات اور گریز اس کی مثال ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی بازگشت "ٹیڑھی لکیر" میں سنائی دیتی ہے۔ اس کے فوراً بعد اردو ناول کی تاریخ میں ایک نیا موڑ آیا۔ تقسیم ہند نے ہجرت کا ایک نیا موضوع دیا اور اسی پس منظر میں انسانی رشتوں کی پیچیدگی ناول نگار کی توجہ کا مرکز بنی اور کرداروں کے ذہنوں کی گرہیں کھولنا اس نے اپنا شعار بنایا۔ تکنیک کے نئے تجربے ہوئے۔ شعور کی رو سے ناول میں بہت کام لیا گیا اور اس ضمن میں قرۃ العین کا کارنامہ یقیناً ناقابلِ فراموش ہے۔

قرۃ العین حیدر کے والد کا نام سید سجاد حیدر یلدرم ہے اور وطن نہٹور ضلع بجنور۔ ان کی پیدائش ۱۹۲۷ء میں علی گڑھ میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں ان کا قیام یورپ میں بھی رہا۔ وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہیں۔ ایک عرصے تک بمبئی میں قیام کے بعد دہلی کو رہایش کے لیے منتخب کیا۔

قرۃ العین حیدر نے اپنا پہلا ناول "میرے بھی صنم خانے" ۱۹۴۹ء میں تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا۔ اس کے چار سال بعد ان کا دوسرا ناول "سفینۂ غمِ دل" منظرِ عام پر آیا۔ موضوع اس کا بھی یہی ہے۔ دونوں ناولوں کی شاندار پذیرائی ہوئی۔ دوسرا ناول فنی اعتبار سے پہلے ناول سے بہتر ہے۔ اس میں تاریخیت زیریں لہر کے طور پر موجود ہے۔ وقت کا تسلسل اس کی اہم خصوصیت ہے۔ اردو ناول کی تاریخ میں اسی کو شعور کی رو کی ابتدائی شکل سمجھنا چاہیے قدیم ہند کی دریافت اس ناول کی دوسری اہم خصوصیت ہے۔ ۱۹۵۹ء میں آگ کا دریا شائع ہوا۔ شعور کی رو اس میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ یہ ناول تاریخ ساز ثابت ہوا اور اس نے اردو ناول کو ایک نئی سمت عطا کی۔ اس زمانے میں جو ناول لکھے گئے ان میں سے اکثر میں "آگ کا دریا" کی پیروی صاف طور پر نظر آتی ہے۔

میرے بھی صنم خانے، سفینۂ غمِ دل، آگ کا دریا، آخرِ شب کے ہم سفر، گردشِ رنگِ چمن اور چاندنی بیگم ان کے ناول ہیں۔ ان کے علاوہ ان کا ایک سوانحی ناول ہے "کارِ جہاں دراز ہے"۔ سیتا ہرن، چائے کے باغ، دلربا، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو ناولٹ ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں پر بہت لکھا گیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ ان پر اور زیادہ لکھا جائے اور ان کی قدر و قیمت کا صحیح تعین کیا جائے۔ انھوں نے اردو ناول کو ایک نئی سمت عطا کی۔ اسے پڑھنے سے زیادہ محسوس کرنے کی چیز بنا دیا۔ ان کے ناولوں

www.urduchannel.in

میں عموماً یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ٹھہرتی نہیں اور یہ کہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ سب کچھ بہا جاتا ہے۔ وقت ایک ایسی طاقت ہے جس کے آگے انسان بالکل بے بس ہے

قاضی عبدالستار

ولادت ۱۹۳۰ء

قاضی عبدالستار ہمارے عہد کے ایک اہم ناول نگار ہیں۔ وہ ۱۹۳۰ء میں بمقام سیتاپور پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم مکمل کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ایک طویل عرصے تک وابستہ رہنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ قاضی صاحب نے اپنے تاریخی ناولوں کے سبب بہت شہرت پائی۔ انھوں نے اودھ کے قدیم جاگیردارانہ ماحول کی نہایت کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ قاضی صاحب کا لب ولہجہ اور ان کے ناولوں کی زبان بڑی اہم ہے۔ وہ ایک ایک لفظ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ اکثر شعری وسائل سے بھی کام لیتے ہیں جس سے ان کی نثر بہت دلکش ہو جاتی ہے۔

شب گزیدہ، دارا شکوہ، صلاح الدین ایوبی اور حضرت جان ان کے اہم ناول ہیں۔

کچھ اور ناول اور ناول نگار

متذکرہ بالا ناول نگاروں کے علاوہ اس عہد کے بہت سے ناول نگار اور بھی ہیں جنھوں نے اچھے ناول لکھے ہیں۔ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اداس نسلیں ــــ عبداللہ حسین کا بہت اہم ناول ہے۔ اس کا کینوس ضرور محدود ہے لیکن انسانی نفسیات کا نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ "آگ کا دریا" سے مشابہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا موضوع ماضی ہے اور اس کا حال و مستقبل۔ ان کے دوسرے ناول "باگھ" "قید" اور دو ناولٹ "ندی" اور "رات" بھی قابلِ ذکر ہیں۔

خدا کی بستی ــــ اس کے مصنف شوکت صدیقی ہیں۔ متوسط اور اس سے زیادہ نچلے طبقے کے کرداروں کو بنیاد بنا کر ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا ہے۔

آنگن ــــ خدیجہ مستور کا سیدھا سادہ مگر بے حد دلچسپ ناول ہے۔ ملک کی تقسیم اس کا موضوع ہے۔ فن کار نے بعض بہت دلچسپ کردار پیش کیے ہیں۔ جمی اس کا سب سے جاندار کردار ہے۔ دیگر اہم کردار ہیں عالیہ، کرمن بوا، بڑی مالکن، صفدر، اسرار میاں اور جمیل۔

علی پور کا ایلی ــــ اس ضخیم ناول کے مصنف ممتاز مفتی ایک بڑے فنکار ہیں۔ مگر ناول کی غیر معمولی ضخامت اس کی مقبولیت کے راستے میں رکاوٹ بن گئی۔ مشہور طنز نگار ابن انشا نے ظرافت سے اسے اردو کا گرنتھ صاحب کہا ہے۔ اس میں مختلف کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا نہایت فنکارانہ اظہار ہے۔

آبلہ پا ــــ رضیہ فصیح احمد کا بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھا جانے والا ہے۔ اس کی کہانی تو سیدھی سی ہے مگر تکنیک ذرا مختلف۔ اس کے راوی بدلتے رہتے ہیں۔ خیال، خواب، خطوط، خود کلامی جیسی چیزوں سے بہت مدد لی گئی ہے۔ یہاں حقیقت اور افسانے کی آمیزش ہے۔ "انتظار موسم گل" اور "چہرہ بہ چہرہ مو بہ مو" ان کے دوسرے ناول ہیں۔

تلاش بہاراں ــــ جمیلہ ہاشمی ہماری معتبر ناول نگار اور "تلاشِ بہاراں" ان کا مقبول ناول ہے۔ اس میں ساری کہانی راوی کی یادداشتوں کے سہارے واحد متکلم میں سنائی جاتی ہے۔ کنول رانی ٹھاکر اس کا بنیادی کردار ہے جو ابھرا ہے۔ یہی اس کی خامی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے دوسرے ناول ہیں "آتش رفتہ" اور "چہرہ بہ چہرہ روبرو"۔ "آتش رفتہ" "تلاشِ بہاراں" سے پہلے لکھا گیا۔ "روہی" ان کا ایک اور ناول ہے۔

Lightshot

www.urduchannel.in

لھو کے پھول ــــ حیات اللہ انصاری کا ضخیم ناول جو پانچ جلدوں میں شائع ہوا۔ مصنف نے اپنے اداریے اور مضامین اس میں جوڑ دیے ہیں۔ اس لیے یہ ناول کم اور سیاسی تاریخ زیادہ ہے۔ اسے بجا طور پر کانگریس کا پروپیگنڈہ کہا گیا ہے۔ ان کا ایک ناول "مادر" ہے۔

انقلاب ــــ خواجہ احمد عباس کا ناول ہے جس کا محور انسان دوستی کا جذبہ ہے۔ مصنف کو زبان و بیان پر مکمل عبور ہے۔ فن کے تقاضوں سے بھی وہ باخبر ہیں۔ انقلاب کی ضرورت و اہمیت سے وہ بھی واقف ہیں اور ان کے قارئین بھی تاہم مصنف کا یہ احساس ایک کامیاب ناول کا روپ اختیار نہیں کر سکا۔

بستی ــــ جلاوطنی انتظار حسین کے اس ناول کا موضوع ہے۔ وہ اتر پردیش کے ایک قصبے سے سکونت ترک کر کے پاکستان گئے اور اپنے وطن کو بھلا نہ سکے۔ یہ جذبہ ان کی بیشتر تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ "بستی" کو ایک طرح سے انتظار حسین کی آپ بیتی کہا جا سکتا ہے۔

* * *

ہمارے عہد کے اور بہت سے ناول ہیں جن کا اتنے اختصار کے ساتھ ذکر بھی ممکن نہیں۔ یہاں ان کے صرف نام گنائے جاتے ہیں۔

فضل احمد کریم فضلی کا "خونِ جگر ہونے تک"، قدرت اللہ شہاب کا "یا خدا"، حجاب امتیاز علی کا "پاکل خانہ"، الطاف فاطمہ کا "دستک نہ دو"، صغریٰ مہدی کا "پروائی"، فاروق خالد کا "سیاہ آئینے"، جیلانی بانو کا "ایوانِ غزل"، آمنہ ابوالحسن کا "واپسی"، علیم سرور کا "بہت دیر کر دی"، بشریٰ رحمٰن کا "پیاسی" اور "جارہ گر"، نثار عزیز بٹ کے "نے چراغے نے گلے"، "کاروانِ وجود" اور "نگری نگری پھرا مسافر"، انور سجاد کا "خوشیوں کا باغ"، مستنصر حسین تارڑ کا "فاختہ"، سلیم اختر کا "ضبط کی دیوار"، رشیدہ رضویہ کا "اسی شمع کے آخری پروانے" ہمارے عہد کے مقبول ناول ہیں۔

---

⑥

مختصر افسانہ

داستان، ناول اور افسانہ دراصل ایک ہی نثری صنف کے مختلف روپ ہیں۔ ان تینوں کو ملا کر "افسانوی ادب" یا "فکشن" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ ان تینوں کی بنیادی خصوصیت ایک ہے اور وہ ہے قصہ پن یعنی ہر قدم پر یہ جاننے کی خواہش کہ آگے کیا ہوا اور اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ یہ کہانی پن یا قصہ پن ہی فکشن کی جان ہے۔

جب انسان کو بہت فرصت تھی تو وہ ایسے قصے سنتا اور سناتا تھا جو بہت طویل ہوتے تھے۔ اس زمانے میں وہ ایسی باتوں اور ایسی چیزوں پر یقین کر لیتا تھا جو عقل کو دنگ کر دیتی ہیں۔ ان کو فوق فطری عناصر کہا جاتا ہے۔ داستانوں میں ان کی بہتات ہوتی تھی۔ مگر زمانے کا ورق پلٹا۔ انسان کی مصروفیت بڑھی اور غیر فطری باتوں پر سے اس کا ایمان اٹھ گیا۔ زندگی کے حقیقی واقعات کو اس نے اپنے قصوں کا موضوع بنایا اور غیر ضروری طوالت سے دامن بچایا تو ناول وجود میں آیا۔ مصروفیت اور بڑھی تو افسانہ وجود میں آیا۔ افسانہ چھوٹا سا ہوتا ہے اس لیے اس میں پوری زندگی کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں زندگی کے کسی ایک رخ سے اور کردار کے کسی ایک پہلو سے سروکار رہتا ہے۔ افسانے کے اجزائے ترکیبی بھی وہی ہیں جو ناول کے ہیں مگر افسانے کا پیمانہ چھوٹا ہوتا ہے اس لیے ان کے اجزائے ترکیبی کے برتنے کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔

www.urduchannel.in

اجزائے ترکیبی

افسانے کی دنیا میں بہت انقلاب آتا رہا ہے۔ پلاٹ، کردار، نقطۂ نظر اور وحدتِ تاثر کے بغیر کچھ دن پہلے تک افسانے کا تصور ممکن ہی نہ تھا مگر ایسا زمانہ بھی آیا کہ بغیر پلاٹ کی کہانیاں لکھی جانے لگیں، بغیر کسی مرکزی کردار کے کہانیاں لکھی گئیں۔ نقطۂ نظر کو تو افسانہ ہی کیا سارے ادب کے لیے مضر اور مہلک ٹھہرایا گیا۔ وحدتِ تاثر کے بارے میں کہا گیا کہ اس کا تو وجود سرے سے ہے ہی نہیں۔ جدید افسانہ پڑھنے والے کے ذہن میں مختلف بلکہ متضاد تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ آخر علامتی اور تجریدی افسانے نے جنم لیا جس کے لیے روایتی اجزائے ترکیبی فضول اور بے معنی ہو کر رہ گئے لیکن ہم ادب کے طالب علموں کو بہرحال ان سے بخوبی واقف ہونا چاہیے۔ افسانے کے ہر ایک جزو کے بارے میں مختصر معلومات یہاں فراہم کی جاتی ہے۔

پلاٹ ــــ مختصر افسانے میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اس میں ترتیب کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اسی سے افسانہ آگے بڑھتا ہے اور اسی کا نام پلاٹ ہے۔ واقعات میں پہلے سے ترتیب قائم کر لی جائے تو افسانہ نگار ادھر ادھر بھٹکنے سے بچا رہتا ہے۔ مرکزی خیال پر اس کی نظر جمی رہتی ہے۔ غیر ضروری تفصیلات افسانے کے ارتقا میں رکاوٹ نہیں بنتیں اور افسانہ منطقی ترتیب سے آگے بڑھتے بڑھتے نقطۂ عروج تک پہنچ جاتا ہے۔ پلاٹ سادہ اور غیر پیچیدہ ہو تو قاری کا ذہن الجھنے سے بچا رہتا ہے اور آسانی سے فن کار کا ہمسفر بنا رہتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے جدید افسانہ نگاروں کا ایک گروہ پلاٹ سے بیزار ہو گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب زندگی میں کوئی نظم و ترتیب نہیں تو افسانے میں لازمی طور پر پلاٹ کا ہونا ایک

غیر فطری بات ہے۔ اس لیے بغیر پلاٹ کی کہانیاں لکھی گئیں مگر وہ قاری کی گرفت سے باہر ہی رہیں اور اب یہ خیال عام ہے کہ افسانے میں کہانی پن کا ہونا ضروری ہے۔ کہانی پن واقعات سے پیدا ہوتا ہے اور واقعات میں ظاہر طور پر نہ سہی تو پوشیدہ طور پر ربط ضرور ہوتا ہے۔ یہی ربط "پلاٹ" ہے اور افسانے میں اس کی اہمیت مسلّم ہے۔

کردار ــــ افسانے میں کردار پلاٹ سے کم اہم نہیں۔ افسانے میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ کسی نہ کسی کردار کے سہارے ہی پیش آتے ہیں۔ اس لیے افسانے میں کردار نگاری کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ناول نگار کو یہ سہولت ہوتی ہے کہ کردار پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی جا سکے اور اسے ہر روپ میں دیکھا جا سکے لیکن افسانے کا پیمانہ محدود ہوتا ہے اس لیے افسانہ نگار کردار کا ہر رخ پیش نہیں کر سکتا۔ وہ کسی ایک زاویے سے روشنی ڈال کر اس کا کوئی اہم پہلو نمایاں کرتا ہے۔

کردار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ جامد یعنی ٹھہرے ہوئے کردار جو شروع سے آخر تک یکساں رہتے ہیں۔ یہ بات فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ اچھا اور سچا کردار وہی ہے جو حالات کے ساتھ تبدیل ہوتا رہے۔ اس کا ارتقا جاری رہے۔ اسی طرح یہ بھی نہ ہو کہ کردار صرف خوبیوں اور خرابیوں کا مجموعہ ہو اسی کردار کو کامیاب کہا جا سکتا ہے جو دنیا کے حقیقی اور اصلی انسانوں جیسا ہو۔

یہ بھی کہا گیا کہ افسانے کے لیے کردار کا ہونا ضروری نہیں۔ بے شک ہیرو کے بغیر اچھا افسانہ لکھا جا سکتا ہے کیوں کہ حقیقی زندگی میں کتنے ہیرو نظر آتے ہیں؟ غلام عباس کی کہانی "آنندی" کو لیجیے۔ اس میں کوئی ہیرو یا کوئی مرکزی کردار نظر نہیں آتا لیکن کہانی کسی کے سہارے تو آگے بڑھے گی خواہ وہ انسان نہ ہو کر چرند پرند ہی کیوں نہ ہوں۔

غرض کردار نگاری افسانے کی جان ہے۔ افسانہ نگار جتنا کامیاب کردار نگار ہوگا، نفسیاتِ انسانی کا جتنا ماہر ہوگا، اتنا ہی اچھا افسانہ پیش کر سکے گا۔

www.urduchannel.in

نقطۂ نظر ــــ ہر فن کار کوئی خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے اور اس نقطۂ نظر کی پیش کش کے لیے ہی فن کار اپنی تخلیق کو جنم دیتا ہے۔ مثلاً پچھڑے ہوئے طبقے کی خراب و خستہ مالی حالت نے پریم چند کو رنج پہنچایا۔ ان کی خستہ حالی سے ملک کو روشناس کرانے کے لیے انھوں نے ایک لازوال افسانہ "کفن" پیش کر دیا۔ مولوی نذیر احمد نے محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کی نقل نہیں کرنی چاہیے۔ اپنا یہ نقطۂ پیش کرنے کے لیے انھوں نے ایک ناول "ابن الوقت" تصنیف کیا۔

ہر انسان ہر معاملے میں اپنا نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ مصنف حساس ہونے کے ساتھ ساتھ بالعموم مطالعے اور مشاہدے کی دولت سے بھی مالا مال ہوتا ہے۔ اس لیے ممکن نہیں کہ کسی معاملے میں اس کا اپنا کوئی نقطۂ نظر نہ ہو۔ لیکن فن کار کا کمال اس میں ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو زیادہ نمایاں نہ ہونے دے۔ چنانچہ افسانہ "کفن" میں پریم چند اپنے نقطۂ نظر کو بہت واضح نہیں ہونے دیتے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی ہمدردی اس غریب طبقے کے ساتھ ہے جو بے حد غریب ہونے کے ساتھ، کاہل اور کام چور بھی ہے اور اتنا بے حس بھی کہ ایک مظلوم عورت کے کفن کا چندہ شراب اور پوری کچوری میں اڑا دیتا ہے یا اس امیر طبقے کے ساتھ جو ضرورت کے وقت غریبوں کی مدد کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ اس کے برعکس مولوی نذیر احمد اپنے نقطۂ نظر کو چھپا نہیں پاتے، یہی ان کی کمزوری ہے۔

ماحول اور فضا ــــ مختصر افسانے میں ماحول اور فضا کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ دراصل کہانی میں ماحول کی تصویر اس طرح کھینچی جاتی ہے کہ اس سے وہ فضا ابھر آئے جو فن کار پیش کرنا چاہتا ہے۔ ضرورت کے مطابق وہ غم، خوشی، خوف، حیرت، اداسی کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ سناٹا نیز رات کی تاریکی سے خوف کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ چمن، سبزہ زار اور چاندنی رات، پُرمسرت ماحول کو جنم دیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پوری کہانی میں یکساں ماحول رہے۔ ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کہانی کی تعمیر میں فضا آفرینی کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ فضا کہانی کی تعمیر میں نہایت اہم رول ادا کرتی ہے اور اس طرف فن کار جتنی توجہ دے گا اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

اسلوب ــــ کہانی کا اسلوب یا طرزِ نگارش کہانی کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ افسانے کا کینوس بہت چھوٹا ہوتا ہے اس لیے ضروری ہوا کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ دی جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہانی کا ایک ایک لفظ اسے آگے بڑھانے میں مددگار ہو۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ کہانی کا فن غزل کے فن سے بہت ملتا جلتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ افسانے کی زبان بہت شگفتہ و دلنشین ہونی چاہیے تاکہ قاری شروع سے آخر تک پوری طرح گرفت میں رہے لیکن اس رائے سے ہمیں پوری طرح اتفاق نہیں۔ قاری کو جو چیز گرفت میں رکھتی ہے وہ دلکش اندازِ بیان نہیں بلکہ یہ تجسس ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے، اب کیا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اس کی نظر آنے والے واقعات پر رہتی ہے۔ رنگین دل آویز بیان اس راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس لیے افسانے کی زبان میں سادگی کے ساتھ دلکشی ہو تو وہ افسانے کے لیے نہایت موزوں رہتی ہے۔

بیانیہ کے علاوہ افسانے میں مکالمے بھی ہوتے ہیں۔ ان سے کرداروں کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مکالموں کا مختصر، دلچسپ اور برمحل ہونا ضروری ہے۔ اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ مکالمہ جس کردار کی زبان سے ادا ہوا ہے بالکل اس کے حسبِ حال ہو۔ مثلاً عالم کے منھ سے عالمانہ اور گنوار کے منھ سے گنوارو زبان ہی ادا ہونی چاہیے۔

آغاز و اختتام ــــ کہانی کا آغاز ایسا ہونا چاہیے کہ پڑھنے والا فوراً متوجہ ہو جائے اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو جائے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ یہ خواہش آخر تک باقی رہے اور جب افسانہ ختم ہو تو پڑھنے والے کے دل پر ایک گہرا نقش

www.urduchannel.in

چھوڑ جائے۔ بعض روسی افسانہ نگاروں نے تو ایسی کہانیاں لکھیں جو کاغذ پر ختم ہونے کے ساتھ ہی قاری کے ذہن میں شروع ہو جاتی ہیں۔ مطلب یہ کہ قاری کے دماغ میں ایک ایسا سوالیہ نشان ابھرتا ہے جس کا جواب وہ آیندہ زندگی میں ڈھونڈتا رہتا ہے۔ یہی فن کا کمال ہے۔

وحدتِ تاثر — کہانی میں وحدتِ تاثر کا پایا جانا ضروری ہے۔ مراد یہ ہے کہ کہانی پڑھنے والے کے دل پر جو کیفیت گزرے اس میں بکھراؤ نہ ہو مثلاً ایسا نہ ہو کہ کہانی کے ایک حصے سے دل پر حیرت کی کیفیت گزرے، دوسرے سے خوف پیدا ہو تو تیسرے سے خوشی بلکہ پوری کہانی سے دل پر کوئی ایک کیفیت پیدا ہو۔ اس کے خلاف بھی بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ آج کی زندگی میں بکھراؤ ہے۔ ہمارے دل پر ہر لمحہ کوئی نئی کیفیت گزرتی ہے اور ہم ہر پل کسی نہ کسی جذبے سے دوچار ہوتے ہیں۔ اصل زندگی میں یہ صورت ہے تو افسانے میں وحدتِ تاثر کیوں تلاش کی جائے۔

٭ ٭ ٭

اب سے کچھ عرصہ قبل افسانہ نگاروں کی ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جس نے افسانے کے روایتی اجزائے ترکیبی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ بات صرف اردو افسانے تک محدود نہ تھی بلکہ افسانے کی دنیا میں انقلاب کی یہ لہر عالم گیر تھی۔ اس نے پلاٹ، کردار، وحدتِ تاثر، آغاز، اختتام، نقطۂ عروج سب کو فضول ٹھہرایا۔ اس طرح کہانی کی جگہ اکہانی وجود میں آئی۔ اس نے افسانے کو چیستاں بنا دیا۔ سب افسانے ایک سے لگنے لگے اور افسانے میں کشش باقی نہ رہی۔ آخر اس تحریک کے خلاف ردِ عمل ہوا اور دھیرے دھیرے افسانے کے قدم زمین پر ٹکنے لگے اور یہ احساس عام ہوا کہ افسانے میں افسانویت یعنی کہانی پن کا پایا جانا بہرحال ضروری ہے۔ بے شک افسانہ علامتی ہو سکتا ہے لیکن معنی کی ایک سطح ضرور ایسی ہونی چاہیے غور و فکر کے بعد جس تک رسائی ممکن ہو۔ اور اب ایسے افسانے ہی مقبول ہیں۔

افسانے کا ارتقا

مختصر افسانے کی ابتدا انیسویں صدی کے شروع میں واشنگٹن اِروِن کے ہاتھوں امریکہ میں ہوئی۔ اس نے "اسکیچ بک" لکھ کر مختصر افسانے کا پہلا نمونہ پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مختصر افسانے کو پڑھ کر قاری کے دل پر ایک خاص کیفیت گزر جاتی ہے اور یہی مختصر افسانے کی پہچان ہے۔ اس کے بعد ناتھینیل ہاتھارن نے اس میدان میں قدم رکھا۔ اس نے حسنِ بیان اور صناعی کو بڑی اہمیت دی اور افسانہ نگاری کو ایک مشکل فن بنا دیا۔ پھر ایڈگر ایلن پو کے ہاتھوں افسانے کو بہت فروغ ہوا۔ اس نے افسانہ نگاری کے فن کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ افسانے کو ایک نشست میں ختم ہو جانا چاہیے۔ اس میں وحدتِ تاثر پائی جانی چاہیے، شروع سے آخر تک لہجے میں ہم آہنگی رہنی چاہیے۔ پورے بیان کی بنیاد اصلیت پر ہونی چاہیے۔ نیاپن اور جامعیت پائی جانی چاہیے۔ پو کے بعد مغرب و مشرق میں افسانہ نگاری کا چلن ہو گیا اور اس صنف کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ فرانس، روس، امریکہ اور انگلستان میں بڑے بڑے افسانہ نگار پیدا ہوئے جن میں ڈکنس، اسٹونسن، اناطول فرانس، مارسل پروست، چیخوف اور موپاساں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ہمارا مختصر افسانہ ابھی بہت کم عمر ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ہندوستان کے مشہور چھوٹے چھوٹے قصوں کو ایک چھوٹی سی کتاب میں جمع کر دیا تھا اور اس مجموعے کو "قصصِ مشرق" کا نام دیا تھا۔ مولوی نذیر احمد نے بھی بعض چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو بچوں کے لیے اپنی زبان میں لکھا تھا اور اس کا نام "منتخب الحکایات" رکھا تھا مگر ان دونوں کتابوں میں جو چھوٹے چھوٹے قصے پائے جاتے ہیں انھیں مختصر افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔

اردو مختصر افسانے کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی سے ہوتا ہے اور اردو کے اوّلین

www.urduchannel.in

افسانہ نگاروں میں سب سے اہم نام پریم چند کا ہے۔ انھوں نے سماجی مسائل کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا۔ وطن کی محبت، سماجی انصاف اور سیاسی آزادی کی خواہش کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ گاندھی واد اور ترقی پسند تحریک نے بھی انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اس راز سے بخوبی واقف تھے کہ ہندوستان کی بیشتر آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ دیہی زندگی سے انھیں گہری واقفیت حاصل تھی اور انسانی فطرت سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے نہایت مختصر عرصے میں انھوں نے ہمارے افسانوی ادب کو لازوال کہانیوں سے مالا مال کر دیا۔

پریم چند کے ہم عصروں میں ایک اہم نام سجاد حیدر یلدرم کا ہے۔ وہ رومانی افسانہ نگار ہیں۔ عورت اور اس کی محبت ان کے افسانوں کا موضوع ہے۔ نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری اور سلطان حیدر جوش بھی یلدرم کے نقش قدم پر چلے۔ ان کے افسانے رومانی اور تخیلی ہیں۔ لیکن یہ رنگ جلد ہی ماند پڑ گیا اور اردو افسانے نے ایک نئی منزل کی طرف قدم اٹھایا۔ افسانے میں یہ تبدیلی اس زمانے کی بات ہے جب دنیا کی سیاست ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ مزدور محنت کش طبقہ بیدار ہوتا ہے۔ یہ اثرات ہندوستان میں بھی محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ جاگیردارانہ سماج زوال کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ صنعتی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اردو افسانہ بھی ان حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ اب وہ تخیل و تصور کی فضاؤں میں پرواز کرنے کے بجائے واقعات کی ٹھوس زمین پر قدم جماتا ہے۔ پریم چند اور اصلاحی تحریک کے دوسرے لکھنے والوں کی حقیقت نگاری اب پہلے سے زیادہ ٹھوس شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یلدرم اور دوسرے رومان نگار بھی زندگی اور زندگی کی واقعیت سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ افسانے میں جذباتیت اور رومانیت کم ہو جاتی ہے۔ سماجی شعور بڑھ جاتا ہے۔ خود پریم چند کے فن میں زبردست انقلاب آتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں "کفن" کی تخلیق ہوتی ہے۔

۱۹۳۶ء میں افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے" شائع ہوا۔ یہ گویا رومانیت سے بغاوت تھی۔ اس میں رشید جہاں، احمد علی، سجاد ظہیر اور محمود الظفر کے افسانے شامل تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ حقیقت نگاری کے ذریعے مروجہ قدروں پر چوٹ کی جائے۔ ان کا رویہ جارحانہ اور سنسنی خیز تھا۔ جنسی معاملات میں ان افسانہ نگاروں نے بہت بے باکی سے کام لیا تھا۔

۱۹۳۶ء سے ہی ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو جاتا ہے اور ادب کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش سے افسانے کی مقصدیت میں نئی جان پڑ جاتی ہے۔ اسی زمانے میں روسی اور فرانسیسی افسانہ نگاروں خصوصاً چیخوف، ترگنیف، موپاساں، زولا اور فلابیر سے واقفیت فراہم ہوئی اور اسی زمانے میں فرائڈ کے نظریات عام ہوئے اور جنسی موضوعات شجر ممنوعہ نہ رہے۔

اس زمانے میں افسانہ نگاروں کی تعداد میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری اور ممتاز مفتی نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ پھر قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کا زمانہ آیا۔ اس زمانے میں افسانہ نگاروں کی تعداد میں ہی اضافہ نہیں ہوا بلکہ افسانے میں نئے موضوعات بھی داخل ہوئے۔

کرشن چندر کے موضوعات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے اور ان کے پڑھنے والوں کا حلقہ بھی۔ ان کے ہاں رومانیت اور حقیقت نگاری کی آمیزش بھی ملتی ہے اور طنز و مزاح کی چاشنی بھی۔ زبان کی لطافت کو بھی انھوں نے بہت اہمیت دی۔ آزادی سے پہلے ان کے جن افسانوں نے شہرت پائی ان میں "زندگی کے موڑ پر"، "کالو بھنگی" اور "ان داتا" شامل ہیں۔

بیدی کا لہجہ دھیما ہے اور چیخوف سے مماثلت رکھتا ہے۔ وہ گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ دانہ و دام اور کوکھ جلی نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔

www.urduchannel.in

منٹو نے جنسیات کو اپنا موضوع بنایا اور "ٹھنڈا گوشت" جیسے افسانے لکھے۔ موذیل، کالی شلوار، میرا نام رادھا ہے ان کے مشہور جنسی افسانے ہیں۔ "نیا قانون" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" جنس کے موضوع سے ہٹ کر ہیں عصمت نے متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیوں کو موضوع قرار دے کر افسانے لکھے۔ چوتھی کا جوڑا، چھوئی موئی، بھول بھلیاں، تل اور لحاف ان کے مشہور افسانے ہیں۔ حسن عسکری، ممتاز مفتی اور عزیز احمد نے بھی جنسی موضوعات پر لکھا۔ ممتاز مفتی فرائڈ سے متاثر رہے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور غلام عباس نے سماجی موضوعات اور پنجاب کی علاقائی زندگی پر قلم اٹھایا۔

ملک تقسیم ہوا اور چاروں طرف فسادات ہوئے تو افسانہ نگار بھی اس خونیں حادثے کی طرف متوجہ ہوئے۔ کرشن چندر نے "ہم وحشی ہیں"، حیات اللہ انصاری نے "شکستہ کنگورے" منٹو نے "ٹوبہ ٹیک سنگھ"، عصمت نے "جڑیں"، انتظار حسین نے "آجودھیا"، قرۃ العین حیدر نے "جلاوطن" جیسے افسانے لکھے۔ اپنے چاروں طرف تباہی اور ابتری دیکھ کر فن کار نے اپنے اندرون میں پناہ تلاش کی۔ ۱۹۵۰ء کے قریب وہ اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا۔ اب "میں" وہ نہ رہ گیا جس کا کوئی نام ہو بلکہ ایک علامت بن گیا۔ اس طرح علامتی اور تجریدی افسانے کا وجود ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد جو افسانہ نگار ابھرے ہیں ان میں قاضی عبدالستار، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، اقبال متین، بلراج مین را، انور عظیم، اقبال مجید، سریندر پرکاش اور انور سجاد نے کافی شہرت پائی۔ بعض جدید افسانہ نگاروں نے افسانے کو پہیلیاں بنا دیا اور فن کا پرانا تصور باقی نہ رکھا۔ وحدتِ تاثر کی شرط بھی باقی نہ رہی اور ایک ابہام کی فضا غالب آگئی لیکن اب افسانہ پھر زندگی کے قریب آرہا ہے اور پھر سے قابلِ فہم ہوتا جارہا ہے۔

اہم افسانہ نگار

اردو افسانے کی عمر زیادہ لمبی نہیں مگر چھوٹی سی عمر میں اس نے بہت ترقی کی۔ اس دوران متعدد بلند پایہ افسانہ نگار پیدا ہوئے اور انھوں نے بہت سی لازوال کہانیاں لکھیں۔ ان مختصر صفحات میں تمام افسانہ نگاروں کا ذکر تو ممکن نہیں اہم افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

پریم چند

جن اہل قلم کی جنبشِ قلم کے طفیل اردو میں مختصر افسانے کا آغاز ہوا اور جن کی نظرِ التفات نے دیکھتے ہی دیکھتے اس صنف کو فن کی بلندیوں ۱۸۸۰ء-۱۹۳۶ء تک پہنچا دیا ان میں سب سے نمایاں نام پریم چند کا ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ناول سے کیا۔ افسانے بعد میں لکھے۔ ان کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" ہے جو ۱۹۰۸ء میں "رسالہ زمانہ" کانپور میں شایع ہوا۔ اسی سال ان کے پانچ افسانوں کا مجموعہ "سوز وطن" کے نام سے شایع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں ہر طرف بیداری کی لہر دوڑ رہی تھی اور آزادی کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ ممکن نہ تھا کہ پریم چند کے افسانوں میں اس کی گونج سنائی نہ دیتی۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور سرکار کے خلاف اشارۃً بھی کچھ نہیں لکھ سکتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے پریم چند کا فرضی نام چن لیا تھا حالانکہ ان کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ انھوں نے کچھ عرصے نواب رائے کے فرضی نام سے بھی لکھا لیکن آخرکار پریم چند قلمی نام اختیار کیا جو سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد بھی برقرار رہا۔

سوز وطن کے افسانوں میں ایسا کچھ نہیں تھا جس سے حکومت کی بنیادیں لرز جاتی۔ اس میں صرف اصلاح پسندی کا جذبہ کارفرما ہے لیکن حکومت کو یہ بھی گوارا نہ ہوا اور مجموعہ ضبط کر لیا گیا۔ آخرکار انھوں نے ملازمت ترک کر دی اور خود کو ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ ان کے افسانوں کے مجموعے پریم پچیسی، خاک پروانہ، آخری تحفہ، زادِ راہ کے نام سے شایع ہوئے جنھیں ملک میں قبول عام حاصل ہوا۔ ان کے شروع کے افسانوں میں قدیم داستانوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس زمانے کے افسانوں میں جو خصوصیات نظر آتی ہیں وہ ہیں زندگی کی حقیقتوں سے نظریں چرانے کا انداز، واقعیت سے گریز، تخیل کی فراوانی،

www.urduchannel.in

قیاس میں نہ آنے والی باتوں کا ذکر، رنگین فضا، جذباتی اندازِ بیان اور شاعرانہ زبان۔ لیکن یہ پریم چند کے افسانے کا تشکیلی دور تھا۔ بہت جلد وہ اس بھول بھلیاں سے باہر نکل آئے۔ بالآخر انھوں نے دیہات کی زندگی کی کامیاب تصویر کشی کی، سماجی مسائل کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا۔ حب وطن، سماجی انصاف کی خواہش، گاندھی واد اور ترقی پسند تحریک نے ان کی کہانیوں کو غذا فراہم کی۔ ان کی تخلیقات کا محور دراصل انسان دوستی ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ صرف پریم چند کے موضوعات ہی اہم نہیں ہیں بلکہ ان کا فن اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ ان کے بیشتر پلاٹ منظم ہیں۔ کہانی کی تعمیر پر وہ بہت توجہ کرتے ہیں۔ ان کے کردار اصلی اور فطری ہیں۔ یہ کردار زندگی بھر ہمارا پیچھا کرتے ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان سے کہیں نہ کہیں ملے ہیں اور ان کے عادات واطوار سے بخوبی واقف ہیں۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ پریم چند نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ذہن انسانی کی یہ مہارت ان کے افسانوں کو حقیقی زندگی سے بالکل قریب کر دیتی ہے اس لیے ان کے افسانے ہمیں قصہ کہانی نہیں لگتے بلکہ اصل زندگی کے سچے واقعات معلوم ہوتے ہیں۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کا ایک پہلو اور ہے۔ وہ اصلاح پسند ہیں اور ہندوستانی سماج کی برائیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ غریبوں پر ظلم، سرمایہ داروں اور مذہب کے ٹھیکیداروں کی زیادتیاں، اونچی ذات والوں کا دوسروں کو حقیر سمجھنا اور اسی طرح کی دوسری برائیاں انھیں تڑپا دیتی ہیں۔ اس لیے انھیں دور کرنے کی خواہش ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے چنانچہ وہ اصلاحی افسانے لکھتے ہیں اور مثالی کردار پیش کرتے ہیں۔ اکثر کہانیوں میں وہ نیکی کی جیت اور بدی کی ہار دکھاتے ہیں۔ بعض جگہ یہ غیر فطری لگتا ہے اور حقیقت نگاری درس اخلاق پر قربان ہو جاتی ہے۔ پریم چند کے ناولوں اور افسانوں میں یہ خامی بیشک موجود ہے لیکن اس خامی پر ان کی خوبیاں حاوی ہیں۔

پریم چند کے افسانوں کی ایک بہت بڑی خوبی ان کی سادہ وسلیس اور شفاف و

بے تکلف زبان ہے۔ شروع شروع میں وہ نامانوس اور ثقیل الفاظ استعمال کرتے تھے لیکن آگے چل کر وہ بول چال کی سادہ وسہل زبان استعمال کرنے لگے۔ تصنع اور بناوٹ سے وہ رفتہ رفتہ دور ہو گئے اور آخر کار انھوں نے اردو کے افسانوی ادب کو ایک جاندار اور شگفتہ اسلوب عطا کیا۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سوناموت کی علامت ہوگی۔" خود پریم چند کے شاہکار افسانے سوتیلی ماں، گلی ڈنڈا، سوا سیر گیہوں، نمک کا داروغہ، زیور کا ڈبہ، خون سفید، ستیہ گرہ، بڑے گھر کی بیٹی، نوک جھونک، پوس کی رات، کفن، نجات اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں

سجاد حیدر یلدرم

۱۸۸۰ء-۱۹۴۳ء

پریم چند کے معاصرین میں ایک اہم نام سجاد حیدر یلدرم کا ہے۔ نہٹور ضلع بجنور ان کا وطن ہے۔ یہیں ۱۸۸۰ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ آئے۔ ترکی زبان وادب سے انھیں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ترکی افسانوں نے انھیں خاص طور پر متاثر کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو ترکی زبان سے واقفیت کے سبب عراق کے ترکی سفارت خانے میں ترجمان کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ مختلف ملازمتوں کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ آخر کار لکھنؤ میں اقامت اختیار کی۔ یہیں ۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

یلدرم کی یہ کوشش قابل ستایش ہے کہ انھوں نے تراجم کے ذریعے اردو ادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ انھوں نے ترکی افسانوں کو اردو کا پیراہن عطا کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ترکی معاشرت کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اس انداز سے پیش کیا کہ ہمیں وہ اپنی معاشرت کا ہی ایک روپ نظر آتا ہے۔ یہ ترجمے ایسی سلیس اور شگفتہ زبان میں ہیں کہ ان پر ترجمے کا گمان نہیں

www.urduchannel.in

ہوتا بلکہ یہ طبع زاد افسانے معلوم ہوتے ہیں۔

ترکی سے تھوڑے ہی فاصلے پر روس میں ایسے افسانے تخلیق ہو رہے تھے جو زندگی کی حقیقتوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں لیکن ترکی افسانے پر رومانیت کا غلبہ تھا۔ ان افسانوں کے مطالعے اور ترجمے کا یہ نتیجہ نکلا کہ یلدرم نے خود بھی جو افسانے لکھے ان میں رومانیت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ زبان کی نفاست اور سجاوٹ پر ان کی توجہ اتنی زیادہ ہے کہ اکثر ناگوار ہوتی ہے۔ "خیالستان" جو ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے اس میں روسی اور انگریزی افسانوں کے تراجم کے علاوہ یلدرم نے اپنے طبع زاد افسانے بھی شامل ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک

۱۹۱۰ء - ۱۹۹۶ء

اوپندر ناتھ اشک پریم چند کے نامور معاصرین میں سے ایک ہیں اور پریم چند سے خاص طور پر متاثر ہیں۔ ان کے افسانوں پر ایک لمبے عرصے تک ناصحانہ اور اخلاقی رنگ غالب رہا۔ پریم چند کے افسانوں میں بھی یہی صورت تھی۔ مگر وہ آخر کار اس سے باہر نکل آئے لیکن اشک ایک طویل عرصے تک اس سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ اپنے ملک کی معاشرت پر وہ گہری نظر ڈالتے ہیں اور اس کی برائیوں پر ان کی نظر جم کر رہ جاتی ہے اور ان کے اصلاحی افسانے وجود میں آتے ہیں۔ اشک کے موضوعات میں سیاست بھی داخل ہے لیکن یہاں بھی انداز اخلاقی اور اصلاحی ہے۔

اشک نے ایک طویل مدت تک اپنے تمام تر وقت کو افسانہ نگاری پر صرف کیا۔ اس سے فن پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی اور زبان میں زیادہ روانی آ گئی۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا کوئی منفرد اسلوب نہیں اور اردو افسانے پر وہ کوئی گہرا نقش نہیں چھوڑ سکے لیکن اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اپنے زرخیز قلم سے انھوں نے اردو افسانے کے ذخیرے میں بہت اضافہ کیا۔ ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں ڈاچی، کونپل، قفس، ناسور وغیرہ اور ان مجموعوں کے بیشتر افسانوں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا۔

سدرشن

۱۸۹۶ء - ۱۹۶۷ء

پنڈت بدری ناتھ سدرشن کا زمانہ بھی وہی ہے جو پریم چند کا لیکن دونوں کا انداز جداگانہ ہے۔ پریم چند کے برعکس ملک کو درپیش مسائل کا سامنا کرنے کی جرأت سدرشن میں نظر نہیں آتی۔ نہ وہ انسانی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے سیدھے سادے ہیں۔ واقعات کو ترتیب دینے میں انھیں البتہ بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانے کا قاری ہر لحظہ یہ جاننے کے لیے بے تاب رہتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ گویا وہ کہانی سنانے کا ہنر جانتے ہیں اور قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

سدرشن کے افسانوں کی دلکشی کا ایک راز سادگی ہے۔ ان کی کہانیوں میں پیچیدگی نہیں ہوتی اور وہ پڑھنے والے کے ذہن پر بار نہیں بنتیں۔ ان کے افسانوں کی زبان بھی سادہ و سہل ہوتی ہے مگر اس زبان کو روکھا پھیکا ہرگز نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان کی سادگی میں ایک طرح کی دلکشی پائی جاتی ہے۔

سدرشن کے افسانوں کے کردار بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ کردار وہ اصل زندگی سے لیتے ہیں۔ اپنے افسانے کو وہ شہر یا دیہات میں قید نہیں کرتے نہ امیروں یا غریبوں تک محدود کرتے ہیں بلکہ جہاں کہیں انھیں کوئی قابلِ ذکر بات نظر آتی ہے اسے اپنے افسانے میں سمو لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی تعداد زیادہ نہیں۔

سلطان حیدر جوش

وفات ۱۹۵۴ء

سلطان حیدر جوش کا وطن بدایوں تھا لیکن ان کی والدہ دہلی کے ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کا سلسلہ حکیم احسن اللہ خاں دہلوی سے ملتا تھا۔ غالباً اسی ننھیال کی نسبت سے سلطان حیدر کا بچپن دہلی میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ آئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ڈپٹی کلکٹری کے عہدے تک پہنچ کر پنشن لی اور علی گڑھ میں رہائش اختیار کی۔ یہیں ۱۹۵۴ء میں وفات پائی۔

www.urduchannel.in

جوش نے ایک خاص مقصد کو زندگی کا مشن بنا لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اہلِ ہند اور خاص طور پر تعلیم یافتہ اصحاب یورپ کی اندھا دھند تقلید کرتے ہیں۔ بیرونی کا یہ جوش اتنا شدید ہے کہ وہ اچھے اور برے کی تمیز بھی کھو بیٹھے ہیں۔ جوش نے اس کی خرابیاں واضح کرنے کے لیے مضامین لکھے، ناول لکھے اور افسانے لکھے۔ اپنی زندگی کے اس مشن کو پورا کرنے لیے کبھی سنجیدگی کا پیرایہ اختیار کیا تو کبھی طنز و ظرافت کا۔

اصلاح کا جذبہ جوش کے فن پر اس قدر غالب ہے کہ اکثر ان کے افسانے غیر دلچسپ اور محض وعظ بن کر رہ جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مکالموں کے ذریعے کرداروں کے ذہنوں کو بے نقاب کرنے کے بجائے وہ خود تقریر کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ فن کار جوش پر ناصح جوش غالب آجاتا ہے۔

زبان و بیان کی طرف جوش بہت توجہ کرتے ہیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر الفاظ اور ترکیبیں لاتے ہیں تشبیہیں تلاش کرتے ہیں جس سے اکثر اسلوب میں بناوٹ کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

اعظم کریوی

وفات ۱۹۵۵ء

اعظم کریوی کا وطن کرہ (ضلع الہ آباد) تھا۔ وہیں ولادت ہوئی تعلیم انٹرنس کے آگے نہ بڑھ سکی اور انھوں نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ بالآخر کراچی (پاکستان) جا کر سرکاری ملازمت کی لیکن افسانہ نگاری کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ شاعر بھی تھے اس لیے احساس میں شدت اور اظہار میں نفاست زیادہ تھی۔ کراچی میں بھی مقبول رہے لیکن تسلسل کے ساتھ لکھنے کا کام جاری نہ رکھ سکے۔ موت سے پہلے کچھ مدت خاموشی کی زندگی گزاری۔ آخر کار وہیں ۱۹۵۵ء میں شہید کر دیے گئے۔

ان کے افسانوں میں اس لیے زیادہ تاثیر ہے کہ وہ تخیل کی پرواز نہیں دکھاتے بلکہ اصلی زندگی سے مواد اخذ کرتے ہیں اور اسے سادہ و دلکش انداز میں پیش کر دیتے ہیں اس لیے ان کے افسانوں کے واقعات ہمیں اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے بلکہ اپنے دل پر گزرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مقامی حالات و معاملات کو بھی وہ اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔

ان کا کینوس وسیع ہے۔ شہری زندگی، دیہات کی زندگی، زمینداروں اور امیروں کا رہن سہن، غریبوں اور مزدوروں کی تنگدستی ـــــ سبھی کچھ انھوں نے اپنے افسانوں میں سمیٹ لیا ہے۔ ان کا مشاہدہ قوی ہے اس لیے جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ غریب طبقے سے ان کی ہمدردی ان کی تحریر میں چھپی نہیں رہتی۔

اعظم کریوی کی زبان سادہ ہونے کے ساتھ دلکش بھی ہے۔ مکالموں کی طرف ان کی خاص توجہ رہتی ہے۔ جس کی زبان سے مکالمہ ادا ہو رہا ہے بالکل اس کے حسبِ حال معلوم ہوتا ہے۔ ان کے یہاں فارسی اور ہندی کے الفاظ بڑی کامیابی کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔

علی عباس حسینی

۱۸۹۷ء - ۱۹۶۹ء

ان کا وطن موضع بارہ (ضلع غازیپور) تھا۔ وہیں ۱۸۹۷ء میں ولادت ہوئی۔ عربی فارسی کی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ میں حاصل کی۔ انگریزی تعلیم الہ آباد اور لکھنؤ میں ہوئی۔ ایم۔ اے۔ کے بعد ایل۔ ٹی۔ کی سند لی اور درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۶۹ء میں وفات پائی۔

حسینی کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ انھیں انسانی نفسیات پر عبور حاصل ہے۔ وہ ہر کردار کے ذہن کی تہوں کو اس طرح آہستہ آہستہ کھولتے ہیں کہ اس کی مکمل شخصیت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس لیے حسینی کے کردار بہت جاندار اور دلکش ہیں۔ افسانے کے پلاٹ کی طرف بھی ان کی خصوصی توجہ رہتی ہے۔ وہ کہیں پلاٹ میں جھول نہیں پیدا ہونے دیتے۔ البتہ واقعات کی طوالت اور ہر واقعے کی تفصیل پر حد سے زیادہ زور اکثر طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔

حسینی نے سہل نگاری کو اپنایا۔ عربی فارسی کے مشکل، نامانوس الفاظ سے گریز کیا اور آسان عام فہم زبان میں افسانے لکھے۔ البتہ ہندی الفاظ کے انتخاب کی دانستہ کوشش جا بجا نظر آتی ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کے افسانوں کی زبان بہت دلکش ہے۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ

www.urduchannel.in

ان کا سیاسی شعور پختہ نہیں ہے اور یہ درست ہے کہ سیاسی موضوع کی طرف انھوں نے توجہ نہیں کی۔ آئی۔ سی۔ ایس۔، باسی پھول اور کچھ ہنسی نہیں ہے ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

اختر حسین رائے پوری

ولادت ۱۹۱۲ء

رائے پور (قدیم صوبہ متوسط جسے کبھی سی پی کہا جاتا تھا اور آج مدھیہ پردیش ہے) ان کا وطن تھا لیکن تعلیم علی گڑھ اور کلکتہ میں ہوئی۔ اپنی زبان کے علاوہ سنسکرت، ہندی، بنگلا اور فرانسیسی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان زبانوں کی چند تخلیقات انھوں نے اپنی زبان میں منتقل بھی کیں۔ انھوں نے گورکی کی خود نوشت کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نقاد کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ اپنی تحریروں سے انھوں نے ترقی پسند تحریک کو مستحکم کیا لیکن آخر کار اس تحریک سے کنارہ کش ہو گئے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔

ان کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان پر ترقی پسند تحریک کا اثر ضرور رہا لیکن طبیعت کا غالب رجحان رومانیت کی طرف تھا۔ دوسری بات یہ کہ تنقید نگاری بھی ان کا شغل رہا اس لیے جب افسانہ لکھتے ہیں تو اکثر جگہ مضمون نگاری کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے اور واقعات کے بجائے اکثر مختلف مسائل پر بحث چھڑ جاتی ہے جو افسانے کی دلکشی کو کم کر دیتی ہے۔

"محبت اور نفرت" اور "زندگی کا میلہ" ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

کرشن چندر

۱۹۱۴ء - ۱۹۷۷ء

کرشن چندر ہماری زبان کے نہایت مقبول اور ہر دل عزیز افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کے بعد کسی اور افسانہ نگار نے اردو افسانہ نگاری میں اتنا نام پیدا نہیں کیا جتنا کرشن چندر نے۔ وہ ۱۹۱۴ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے۔ بچپن کشمیر میں گزرا، تعلیم لاہور میں پائی اور زندگی کے آخری ایام بمبئی میں گزارے۔ وہیں ۱۹۷۷ء میں وفات پائی۔

انھوں نے وکالت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا لیکن اسی مصروفیت کے دوران اردو اور انگریزی میں لکھنے بھی لگے۔ ان کی افسانہ نگاری کی شروعات رومانی کہانیوں سے ہوئی۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "طلسم خیال" شایع ہوا تو افسانے کے شائقین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی شہرت ہر طرف پھیل گئی اور آخر کار ان کا سارا وقت اسی شغل میں بسر ہونے لگا۔ اس دوران انھوں نے کچھ عرصے کے لیے ریڈیو میں ملازمت کی لیکن اس سے جلد ہی کنارہ کش ہو کر یکسوئی کے ساتھ افسانہ نگاری کرنے لگے۔

وہ اسّی سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے ناول لکھے، ریڈیو ڈرامے لکھے، لیکن ان کی اصل شہرت کہانیوں کے سبب ہے۔ کہانیوں کے قابلِ ذکر مجموعے ہیں نظارے، زندگی کے موڑ پر، ٹوٹے ہوئے تارے، ان داتا، تین غنڈے، سمندر دور ہے، اجنتا سے آگے، ہم وحشی ہیں، دل کسی کا دوست نہیں، میں انتظار کروں گا، کتاب کا کفن۔

کرشن چندر کو افسانہ نگاری کے فن میں زبردست مہارت حاصل ہے۔ شہر اور دیہات دونوں کی زندگیوں کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ انسان دوستی کا جذبہ ان کی تمام تخلیقات میں کارفرما ہے۔ انسان کی امنگوں اور آرزوؤں سے وہ پوری طرح واقف ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی جانتے ہیں کہ کس طرح اس بے رحم دنیا میں انسان کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ یہ عرفان انھیں ترقی پسند تحریک سے حاصل ہوا۔ اس لیے ان کے افسانوی ادب پر ایک طرف رومانیت کی چھاپ ہے تو دوسری طرف حقیقت پسندی کا گہرا رنگ ہے۔ انھیں سماج کے اس نظام سے نفرت ہے جو غریبوں اور مزدوروں کی آرزوؤں کا خون کرتا ہے۔ اس لیے اکثر اس نظام کو شدید طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

جذبات نگاری کرشن چندر کے افسانوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ انسانی جذبات کی عکاسی میں انھیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان بہت رنگین اور شیریں ہوتی ہے۔ ان کے پرستاروں کا ایک حلقہ ان کے اندازِ بیان پر ہی فریفتہ ہے۔ یہ

www.urduchannel.in

شیریں بیانی کہیں کہیں فن کے راستے میں رکاوٹ بھی بنتی ہے۔

کرشن چندر ایک بلند رتبہ فن کار ہیں۔ احتشام حسین کے الفاظ میں عوام کے ساتھ ان کی سچی محبّت، انسان کے مستقبل پر اعتماد اور ناانصافی کے خلاف اظہارِ نفرت کی خواہش ان کی کہانیوں کا موضوع ہیں۔ ان کا فن زندگی کے بدلتے ہوئے ذرائع کے ساتھ چلتا ہے۔ عوام کے مفاد کا تحفظ اور غم انگیز زندگی سے ان کے لیے امرت نکال لینے کی کوشش کرشن چندر کا محبوب موضوع ہے۔ سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر موڑ پر وہ چراغ لیے کھڑے ہیں اور وہ راہ دکھانا چاہتے ہیں جو ترقی اور امن کی طرف جاتی ہے۔

سعادت حسن منٹو

۱۹۱۲ء - ۱۹۵۵ء

اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں منٹو کا شمار ہے۔ انھوں نے لڑکپن سے ہی لکھنے کو اپنا مشغلہ بنا لیا تھا، مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا تھا اس لیے جلد ہی ادب میں اپنی جگہ بنائی۔

سعادت حسن کا تعلق کشمیر کی منٹو ذات سے ہے۔ عام طور پر لوگ اس کا تلفظ بالکسر یعنی مِنٹو کرتے ہیں جو غلط ہے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں سرالہ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ امرتسر میں تعلیم پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا مگر تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ آخر ملازمت کرلی۔ کچھ دنوں اخبار "مساوات" امرتسر میں اور پھر ہفت روزہ "مصوّر" بمبئی میں بحیثیت مدیر خدمات انجام دیں۔ آل انڈیا ریڈیو میں بھی ملازمت کی۔ اس کے لیے متعدد ریڈیائی ڈرامے اور فیچر لکھے جو بہت پسند کیے گئے۔ کچھ عرصہ بمبئی میں رہ کر فلمی دنیا میں قدم جمانے کی کوشش کی۔ آخر تقسیم ملک کے بعد لاہور چلے گئے وہیں ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔

منٹو نے تصنیف و تالیف کی دنیا میں قدم رکھا تو پنجاب انقلابیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ تحریک ان کے رگ و پے میں بھی سرایت کرگئی۔ انھوں نے مارکس کے نظریات اور گورکی کی تحریروں کا مطالعہ کیا اور ان دونوں سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے کچھ روسی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا اور ترقی پسند تحریک سے مانوس ہوگئے۔ لیکن اس راستے

پر وہ زیادہ دنوں نہیں چل سکے اور انھوں نے اپنا راستہ الگ نکال لیا۔

ان کا اصل میدان جنس ہے اور جنس کا بھی صحت مند اور فطری پہلو انھیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا۔ جنسی کج روی انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہ بے محابا اس پر لکھتے ہیں۔ ان پر فحش نگاری کے جرم میں مقدمے چلے اور انھیں عریاں نگار کہا گیا۔ ان کے پاس اس کا جواب یہ تھا کہ سماج میں جہاں جہاں گندگی اور غلاظت ہے میں اس پر خاک دھول ڈال کر اسے چھپاتا نہیں، اسے کریدتا اور صاف کرتا ہوں۔ جب غلاظت کو صاف کیا جائے گا تو لازمی طور پر بدبو پھیلے گی۔ ٹھنڈا گوشت، کالی شلوار، موذیل، میرا نام رادھا ہے، شاداں اسی قبیل کے افسانے ہیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اور نیا قانون اس رنگ سے ہٹ کر ہیں اور ان میں جنس نہیں ہے لیکن ان افسانوں کو منٹو کے نمائندہ افسانے نہیں کہا جاسکتا۔

منٹو نے کچھ لاجواب خاکے بھی لکھے جو "گنجے فرشتے" کے نام سے شایع ہوئے۔ ان میں بے باک حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ میں آغا حشر کی بھینگی آنکھ کو سیدھا نہ کرسکا اور ان کے منھ سے گالیوں کی جگہ پھول نہیں جھڑوا سکا۔ اور یہ ان کے لیے ممکن بھی نہ تھا کیوں کہ منٹو کا کمال یہ ہے کہ جو دیکھتے ہیں بے جھجک اسی کو لکھ دیتے اسی لیے انھوں نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں جو فرشتہ آیا ہے میں نے اس کا مونڈن کیا ہے۔ یعنی ہر ایک کی اصلیت کو بے نقاب کردیا ہے۔ خاکہ نگاری کے ذیل میں منٹو کے دوسرے خاکوں کا ذکر کیا جائے گا۔

منٹو نے بہت لکھا اور نہایت سادہ انداز میں لکھا جیسے کوئی افسانہ نہ لکھ رہے ہوں بلکہ کوئی واقعہ سنا رہے ہوں، یہی ان کا کمال ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں: دھواں، لذت سنگ، منٹو کے افسانے، خالی بوتلیں خالی ڈبے، سیاہ حاشیے، نمرود کی خدائی، ٹھنڈا گوشت، یزید، پھندے، سڑک کے کنارے وغیرہ۔

www.urduchannel.in

راجندر سنگھ بیدی

۱۹۱۵ء - ۱۹۸۴ء

بیدی بہت بڑے فن کار اور ہماری زبان کے بہت مقبول افسانہ نگار ہیں۔ وہ ۱۹۱۵ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم گھر کی چار دیواری میں ہوئی اور قصے کہانیوں سے اس کا آغاز ہوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بچپن میں ان کی اپنی صحت بھی خراب رہتی تھی اور والدہ بھی مسلسل علیل رہتی تھیں۔ اس لیے گھر میں ہی رہنا پڑتا تھا۔ ان کے والد اپنی شریک حیات کی دلجوئی کے لیے ایک پیسہ روز پر قصے کہانی کی کوئی کتاب لے آتے تھے اور سنا کر ان کا دل بہلاتے تھے۔ کم سن راجندر سنگھ بیدی پر ان کہانیوں کا بہت اثر ہوا اور وہ اس طرف مائل ہوگئے۔ ان کی کم عمری ہی میں ان کے چچا نے ایک چھاپہ خانہ خریدا۔ اس کے ساتھ کئی ہزار کتابیں بھی ملیں۔ راجندر سنگھ کو بہت سی دلچسپ کتابیں پڑھنے کا موقع بھی مل گیا۔

انھوں نے باقاعدہ اسکول اور کالج میں بھی تعلیم حاصل کی مگر بہت آگے نہ بڑھ سکے۔ پڑھنے اور کہانیاں لکھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے میں ہی پیدا ہوگیا۔ والدہ کا انتقال ہوجانے کے سبب تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور انھیں ڈاک خانے اور پھر ریڈیو میں ملازمت کرنی پڑی۔ اسی دوران ملک تقسیم ہوگیا اور بیدی بڑی تکلیفیں جھیل کر دہلی پہنچے اور پھر جموں ریڈیو اسٹیشن پر اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ یہ سلسلہ زیادہ دنوں نہیں چل سکا اور وہ بمبئی چلے گئے اور وہاں فلمی دنیا سے رشتہ قائم کرلیا اور فلمیں بھی بنائیں۔ ۱۹۸۴ء میں وہیں وفات ہوئی۔

راجندر سنگھ بیدی ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر رہے اور اپنے افسانوں سے انھوں نے غریب و مظلوم طبقے کی حمایت بھی کی لیکن اس تحریک کو انھوں نے کبھی اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیا اس لیے ان کا فن کبھی پروپیگنڈا نہیں بن سکا۔

زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بیدی اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں اور بکھر

ان کے گرد نہایت فن کارانہ انداز سے کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ کردار کیا کر رہا ہے اس سے زیادہ ان کی توجہ اس پر رہتی ہے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ علم نفسیات سے آگہی اور انسانی ذہن کی تہ میں اتر جانا بیدی کا خاص وصف ہے۔ اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے "لاجونتی" بہترین افسانہ ہے۔ اس کی بدنصیب ہیروئن اپنے شوہر کی ہمدردی تو حاصل کرلیتی ہے مگر اس محبت اور اس بے تکلف تعلق کے لیے تڑپتی رہتی ہے جو اس گھر میں کبھی اس کو حاصل تھا۔

بیدی کی کہانیوں کا موضوع حقیقی زندگی کے انسان ہیں جن کے دلوں میں طرح طرح کی آرزوئیں جنم لیتی ہیں مگر پوری نہیں ہو پاتیں۔ بیدی اپنی ہر کہانی کے لیے بہت غور و فکر اور بے حد توجہ کے ساتھ منصوبہ بندی کرتے ہیں اس لیے ان کی کہانیاں ایسی مربوط اور اتنی گٹھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ایک لفظ بیکار اور غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ افسانے کا مختصر کینوس غیر ضروری طوالت اور غیر اہم جزئیات کا متحمل ہو بھی نہیں سکتا۔

بیدی کی زبان صاف ستھری، نکھری ہوئی لیکن بے جا تصنع اور غیر ضروری آرائش سے پاک ہوتی ہے۔ پان شاپ، دس منٹ بارش میں اور تلادان ان کے کامیاب افسانے ہیں۔ دانہ و دام، گرہن، کوکھ جلی، لمبی لڑکی، اپنے دکھ مجھے دے دو ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

عصمت چغتائی

۱۹۱۵ء - ۱۹۹۱ء

جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے پر ایک دائمی نقش چھوڑا ان میں ایک نمایاں نام عصمت چغتائی کا ہے۔ ان کا آبائی وطن راجستھان ہے۔ وہیں ان کی ولادت اور ابتدائی تعلیم ہوئی۔ بی۔ اے۔ اور بی۔ ایڈ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ وہیں لکھنے کی ابتدائی تربیت بھی ہوئی اور وہیں سے ناول و افسانے کا اوّلین مواد بھی فراہم ہوا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف اسکولوں میں ملازمت کی۔ پھر بمبئی میں مدارس کی انسپکٹریس مقرر ہوئیں۔ وہیں فلمی دنیا سے رابطہ قائم ہوا۔ آخر کار ملازمت ترک کرکے تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مصروف ہوگئیں۔ ۱۹۹۱ء میں

Lightshot

www.urduchannel.in

وفات پائی۔

انھوں نے اپنے افسانوی ادب کے لیے ایک خاص میدان کا انتخاب کر لیا متوسط مسلمان گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگی ان کے فکشن کا موضوع ہے۔ اس محدود میدان میں انھوں نے انتہا درجے کی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان گھرانوں کی اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور ذہنی زندگی کے تمام گوشے ان پر پوری طرح روشن ہیں اور وہ ان کی مکمل تصویر کشی کی غیر معمولی قدرت رکھتی ہیں۔ اس طبقے کی جنسی زندگی سے گہری واقفیت رکھتی ہیں اور اسے بڑی بے باکی کے ساتھ پیش کر دیتی ہیں۔ لحاف ان کا ایسا افسانہ ہے جس پر فحاشی کا الزام لگا اور اس تخلیق کے لیے عصمت کو بہت مطعون کیا گیا۔ چوتھی کا جوڑا میں جنسی پہلو بھی پیش ہو گیا ہے لیکن اس میں جس کامیابی کے ساتھ متوسط مسلمان گھرانوں کی بیٹیوں کی شادی کے مسئلے کو پیش کیا گیا ہے اس کی داد دینی پڑتی ہے۔

اس طبقے کی نفسیات پر بھی عصمت چغتائی کو عبور حاصل ہے۔ وہ انسانی ذہن کو پرت پرت کر کے اس طرح کھولتی ہیں کہ اس کا کوئی گوشہ تاریکی میں نہیں رہتا۔ یہ دیکھنا ہو کہ انسان کی نیکی اور بدی کو وہ کیسے فن کارانہ انداز سے پیش کرتی ہیں تو ان کے افسانے "کچھ کھو کچھی" اور "ننھی کی نانی" کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔

عصمت چغتائی کی زبان بہت دلکش ہے۔ عورتوں کی زبان پر انھیں بطور خاص مہارت حاصل ہے۔ ان کے مکالمے تو بے حد پسند کیے جاتے ہیں۔ ان مکالموں میں حسب ضرورت طنز و ظرافت سے بھی کام لیتی ہیں۔ ان کا ایک ایک جملہ ترشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

اپنے محدود کینوس کے باوجود عصمت چغتائی نے افسانہ نگاری میں ایسی فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے کہ انھیں برسوں یاد رکھا جائے گا۔

کلیاں، چوٹیں، چھوئی موئی، دو ہاتھ ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

اختر اورینوی

۱۹۱۰ء - ۱۹۷۷ء

اختر اورینوی عہد حاضر کے ہمہ جہت مصنف ہیں۔ انھوں نے شاعری کی، تنقیدی مضامین بھی لکھے، ناول اور ناٹک بھی تخلیق کیے لیکن ان کی شہرت کا دارومدار افسانہ نگاری پر ہے۔

ان کا اصل نام سید اختر احمد اورینوی ضلع مونگیر ہے۔ سائنس کے ساتھ انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد انھوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا۔ تعلیم ادھوری تھی کہ تپ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ آخر تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ صحتیاب ہوئے تو آرٹس کی تعلیم شروع کی۔ اردو میں ایم اے۔ کرنے کے بعد پٹنہ میں ہی اردو کے لکچرر مقرر ہوئے اور تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہو گئے۔

بہار کے دیہات کی زندگی کو انھوں نے خاص طور پر اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور اس کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کیے لیکن شہری زندگی کو بھی فراموش نہیں کیا اور اسے بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ متوسط طبقے کے گھرانوں سے انھیں اچھی واقفیت حاصل ہے اور افسانہ نگاری میں اس سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اختر اورینوی علم نفسیات میں بھی درک رکھتے ہیں اور کرداروں کی ذہنی زندگی کو بڑی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں۔ یہی ان کے افسانے کی اصل شناخت ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں "ان کی کہانیوں میں سماجی شعور قلبی احساسات کی راہ سے داخل ہوتا ہے اس لیے وہ ان مصنفوں میں گنے جاتے ہیں جو زندگی کی مصوری میں نفسیات سے کام لیتے ہیں۔"

ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں منظر و پس منظر، بھول بھلیاں، انارکلی، کلیاں اور کانٹے، کیچلیاں، بال جبریل۔

سہیل عظیم آبادی

۱۹۱۱ء - ۱۹۷۹ء

سہیل عظیم آبادی اردو کے ایک نامور افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کی روایت بہار کی سرزمین پر انھی کے دم سے آگے بڑھی۔

www.urduchannel.in

مولوی عبدالحق کی سرپرستی میں انھوں نے بہار میں اردو کے فروغ کی تحریک چلائی۔ اپنے مشہور اخبار "ساتھی" سے انھیں اس کام میں بہت مدد ملی۔ اس کے علاوہ ماہنامہ "تہذیب" نے بھی اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

سہیل عظیم آبادی نے بہت سے افسانے لکھے اور ان افسانوں میں حقیقی زندگی کے مرقعے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کے افسانوں کا دائرہ وسیع ہے۔ پریم چند کی پیروی میں وہ دیہات کی زندگی کو اپنا موضوع بناتے ہیں لیکن شہری زندگی کو بھی فراموش نہیں کرتے۔

سہیل عظیم آبادی پر ترقی پسند تحریک کا اثر بھی صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے غریبوں اور مظلوموں کی حمایت میں آواز اٹھائی اور اپنے افسانوں میں ان کے مسائل کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔

وہ ایک کامیاب فن کار ہیں۔ ان کے فن میں گہرائی ہے کیوں کہ وہ مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں، دلکشی ہے کیوں کہ پلاٹ اور کردار نگاری پر خون جگر صرف کرتے ہیں اور آخری بات یہ کہ زبان پر انھیں پوری دسترس حاصل ہے اس لیے ان کا اندازِ پیش کش بہت موثر ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں "سہیل کے افسانوں میں نہ زندگی پر زیادہ زور پڑتا ہے اور نہ فن پر ان کے یہاں طنز ہے لیکن اس میں تلخی نہیں، ادبیت ہے لیکن اس کا شاعرانہ غلو نہیں، زندگی کی سچائی ہے لیکن اس میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں۔ ان کے افسانے زندگی کے اضطراب لیکن حق کے سکون کے پیامی ہیں"۔

قرۃ العین حیدر

ولادت ۱۹۲۷ء

قرۃ العین حیدر کا آبائی وطن نہٹور ضلع بجنور ہے۔ ان کی ولادت ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ ان کے والد سید سجاد حیدر یلدرم کا شمار اردو افسانے کے بنیاد گزاروں میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے یورپ کا سفر بھی کیا اور یورپی ادب کا بغور مطالعہ کیا جس سے ان کی نظر میں وسعت اور فن میں گہرائی پیدا ہوئی۔ مغربی ادب کے علاوہ ہندوستان کی تہذیب کا مطالعہ بھی انھوں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کیا۔

جیمس جوائس اور ورجینیا وولف کا اثر ان کے یہاں بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ چنانچہ ذہنی فضا کی پیش کش اور کرداروں کے نفسیاتی ردِ عمل کی تصویر کشی میں انھیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے کردار شعور کی رو کے سہارے ماضی کی بے کراں وسعتوں میں سفر کرتے ہیں۔ مثلاً "کیکٹس لینڈ" میں ماضی و حال کی تفریق باقی نہیں رہتی اور زمان و مکاں کی قید ٹوٹ جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر اجتماعی شعور کی بازیافت کرتی ہیں اور ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی زندگی ان کے چند صفحات میں سمٹ آتی ہے۔ قدیم ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ ان کے شعری اسلوب میں ڈھل کے کبھی ناول کا روپ اختیار کرتا ہے تو کبھی افسانے کا۔ ان کے یہاں کہانی پن، سماجی آگہی اور تاریخی بصیرت مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں۔

ان کا مشاہدہ گہرا ہے مگر وہ بالعموم اعلیٰ طبقے کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بناتی ہیں۔ افسانے کے بعض ناقدوں کا خیال ہے کہ اس طرح ان کا دائرہ محدود ہو گیا ہے لیکن ان جانی زمین پر قدم رکھنے کے بجائے وہ مضبوطی سے اپنی زمین پر قدم جمائے رکھنا چاہتی ہیں جسے انھوں نے بہت نزدیک سے دیکھا ہے اور جس کا وہ خود ایک حصہ ہیں۔

قرۃ العین حیدر ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کے افسانے بہت جدید ہونے کے باوجود بے حد پرکشش ہیں۔ ان کا افسانہ "سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات" اس کی مثال ہے۔ ستاروں سے آگے، شیشے کے گھر، پت جھڑ کی آواز، روشنی کی رفتار ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔

شکیلہ اختر

ولادت ۱۹۱۶ء

شکیلہ اختر ۱۶ اگست ۱۹۱۶ء کو اورل ضلع گیا میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور ابتدا ہی سے شعر و ادب کا ذوق دل میں پروان

www.urduchannel.in

چڑھتا رہا۔ گھر کا ماحول بھی ادبی تھا جس نے لکھنے اور چھپنے کا ذوق پیدا کیا۔ شاعری بھی کی اور افسانہ نگاری بھی۔ ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۱ء سے ہوا اور ۱۹۳۶ء میں پہلا افسانہ شایع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے اس زمانے کے مشہور رسالوں مثلاً نیرنگِ خیال، ساقی، عصمت، ادبی دنیا اور کلیم وغیرہ میں چھپتے رہے۔ ان کے افسانوں کے مختلف مجموعے آنکھ مچولی، درپن، ڈائن، تنکے کا سہارا، لہر کے مول منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

شکیلہ اختر نے بہار کے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ بہار کے دیہات خاص طور پر ان کی نگاہ میں رہے ہے۔ ان کے افسانوں میں نزاکتِ احساس بھی ہے اور لطافتِ جمال بھی۔ اسلوب میں سادگی اور دلکشی ہے۔ مقامی الفاظ و محاورات کا بھی بخوبی استعمال کرتی ہیں۔

اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی اور شکیلہ اختر کے اثر سے بہار میں افسانہ نگاروں کی کثرت بھی نظر آتی ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے اردو افسانوی ادب میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ ان میں غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی، ذکی انور، کلام حیدری، عبدالصمد، احمد یوسف، شمیم صادقہ کے نام نمایاں ہیں۔

کچھ اور افسانہ نگار

اردو میں اعلیٰ درجے کے افسانہ نگاروں کی کمی نہیں اور یہ فہرست کافی لمبی ہے۔ ان مختصر صفحات میں کئی اہم افسانہ نگار بھی چھوٹ گئے۔ یہاں ان کا بے حد اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

اختر انصاری : انھوں نے شاعری، تنقید، مضمون نگاری اور افسانہ نگاری کی طرف بیک وقت توجہ کی اس لیے کسی ایک میدان میں نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکے حقیقت میں وہ ایک باصلاحیت افسانہ نگار تھے اور فن پر گہری قدرت رکھتے تھے۔ اندھی دنیا، خونی،

یہ زندگی اور ناری ان کے مجموعے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری : ان کی اصل شہرت نقاد کی حیثیت سے ہے۔ ایک عرصے تک معلم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انگریزی ادب کا مطالعہ گہرا تھا اور کئی شہ پاروں کو اردو میں منتقل بھی کیا۔ انگریزی افسانہ نگار ہارڈی سے بہت متاثر تھے۔ خواب و خیال اور سمن پوش ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

حیات اللہ انصاری : کانگریس کی تحریک سے وابستہ اور گاندھی واد کے علمبردار ہیں۔ مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔ فن پر عبور حاصل ہے۔ زبان پر پوری دسترس ہے۔ "بھرے بازار میں" اور "شکستہ کنگورے" ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

خواجہ احمد عباس : مشہور صحافی اور افسانہ نگار فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔ کہانی کہنے کے فن میں طاق اور زبان و بیان پر مکمل عبور۔ یہ ان کی خصوصیات ہیں۔ ایک لڑکی، زعفران کے پھول، میں کون ہوں اور کہتے ہیں جس کو عشق ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی : شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ انھوں نے پنجاب کے دیہات کی زندگی بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کی ہے۔ رومانی افسانوں سے شروعات کی لیکن جلد ہی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو گئے۔ چوپال، بگولے، آبلے، سناٹا، آنچل، در و دیوار، بازار، حیات ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔

بلونت سنگھ : پنجاب کی دیہاتی زندگی کے نبض شناس اور فنِ افسانہ نویسی کے ماہر۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ جگا، تار و پود، سنہرا دیش اور پہلا پتھر ان کے مجموعے ہیں۔

عزیز احمد : ان کی اصل شہرت ایک ناول نگار کی حیثیت سے ہے۔ انھوں نے کچھ بہت اچھی کہانیاں بھی لکھیں۔ بعض کہانیوں کا موضوع جنس ہے مگر فحاشی سے

www.urduchannel.in

دامن بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ رقصِ ناتمام اور بیکار دن بیکار راتیں ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔

ہنس راج رہبر : مارکس سے متاثر اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ ناول اور تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ ان کے افسانے فن کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ نیا افق اور ہم لوگ ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔

ممتاز مفتی : ان کے افسانے نفسیاتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لاشعور کی کارفرمائی ان کے اکثر افسانوں میں نظر آتی ہے۔ ان کہی، چپ، گہما گہمی ان کے مجموعے ہیں۔

محمد حسن عسکری : ان کے افسانے قاری کو لاشعور اور تحت الشعور کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور فن پر گرفت بہت مضبوط ہے۔ نقاد کی حیثیت سے انھیں بڑی شہرت حاصل ہے۔ ترقی پسند تحریک کے خلاف انھوں نے سخت آواز اٹھائی۔ زبان بے حد دلکش ہے۔ جزیرے اور قیامت، ہم رکاب آئے نہ آئے ان کے مجموعے ہیں۔

ان کے علاوہ جن فن کاروں کا ذکر ضروری ہے ان میں غلام عباس ہیں جن کی خاص شہرت ان کے افسانے آنندی کے سبب ہے۔ مہندر ناتھ، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں، ابراہیم جلیس، اے حمید، پرکاش پنڈت، رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین، اشفاق احمد، رام لعل، انور معظم، جیلانی بانو، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، الیاس احمد گدی ہمارے عہد کے اہم افسانہ نگار ہیں۔

جدید تر افسانہ

پچھلے کچھ برسوں میں اردو افسانے نے کئی کروٹیں لی ہیں۔ ادب کی تمام اصناف

پیچیدگی کی طرف بڑھیں تو افسانہ کیوں پیچھے رہتا اور صرف سیدھا سادہ بیانیہ انداز ہی کیوں اختیار کیے رہتا۔ شاعری غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہے تو افسانے سے کیوں یہ اصرار کیا جائے کہ سنتے ہی سمجھ میں آجائے اور بالکل غور نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ افسانے میں پیچیدگی بھی آئی، مفہوم کی کئی کئی پرتیں بھی پیدا ہوئیں، ابہام نے بھی راہ پائی اور افسانہ وہ نہ رہا جو پہلے تھا۔

پریم چند کا افسانہ "کفن" وہ پہلا فن پارہ ہے جس میں افسانے کی قدیم روایت سے انحراف نظر آتا ہے۔ اس وقت یہ انحراف کسی تحریک کی شکل اختیار نہ کر سکا۔ کچھ ہی دنوں بعد منٹو نے روشِ عام سے ہٹ کر افسانے لکھے۔ منٹو کا افسانہ "پھندنے" افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک نیا تجربہ تھا جس میں پلاٹ کا روایتی تصور ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد قرۃ العین حیدر نے شعور کی رو سے کام لے کر افسانے کو ایک نئی جہت عطا کی اور اردو افسانہ نئی منزلوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

کچھ ہی دنوں بعد افسانہ ایک ایسی شکل میں نمودار ہوا کہ اس کا پہچاننا ہی مشکل ہو گیا۔ پے در پے اس میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ نئے افسانہ نگار نہ پلاٹ کے محتاج رہے نہ کردار کے، نہ نقطۂ نظر کے قائل رہے، نہ وحدتِ تاثر کے، زبان کا مروجہ سانچہ بھی شکست و ریخت سے نہ بچ سکا۔ ساتھ ہی علامتی اور تجریدی افسانہ وجود میں آیا جس سے اردو افسانے میں نئی معنویت اور تہ داری پیدا ہوئی۔

اب افسانہ نگاروں کی جس نسل نے جنم لیا ان میں بعض ایسے بھی تھے جنھیں نہ افسانہ نگاری کے فن پر قابو تھا اور نہ زبان پر۔ انھوں نے نئے پن کی ہوس میں بے سر و پا افسانے لکھے مگر ان کی گنتی زیادہ نہ تھی۔ جدت پسندی کے شوق میں جو خامیاں اردو کے جدید افسانوں میں راہ پا گئی تھیں وہ دور ہوئیں، سیلاب تھما اور یہ احساس پیدا ہوا کہ کہانی میں کہانی پن تو بہرحال ہونا ہی چاہیے اور یہ کہ بے کہانی کی کہانی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اب جو افسانہ نگار افسانے تخلیق

www.urduchannel.in

کر رہے ہیں ان سے یہ توقع ہے کہ یہ صنف جلد بے شمار گراں مایہ افسانوں کی دولت سے مالا مال ہو جائے گی۔

عہد حاضر کے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، انور سجاد، سریندر پرکاش، جوگندر پال، بلراج مین را، احمد ہمیش، خالدہ (اصغر) حسین، رتن سنگھ، شمرون کمار، کمار پاشی، قمر احسن، سلام بن رزاق، نیر مسعود، احمد یوسف، حسین الحق، شوکت حیات، شفق، محمد منشا یاد، مرزا حامد بیگ، اسد محمد خاں، آصف فرخی، سید محمد اشرف اور طارق چھتاری قابلِ ذکر ہیں۔

---

(۷)

ڈراما

ڈراما شاید شاعری کی سب سے قدیم صنف ہے۔ ہندوستان اور یونان دنیا کے وہ دو ملک ہیں جہاں ڈرامے نے پہلے پہل آنکھیں کھولیں۔ چنانچہ ڈرامے کے اصول بھی سب سے پہلے یہیں زیرِ غور آئے۔ بھرت منی نے ہندوستان میں اور ارسطو نے یونان میں ڈرامے کے مسائل پر غور کیا اور اس کے اصول وضع کیے۔ بھرت منی ۱۔ لباس، ۲۔ آواز، ۳۔ جسمانی اعضا کی حرکت، ۴۔ رقص اور ۵۔ موسیقی کو ڈرامے کے لازمی اجزا بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ڈرامے سے ناظرین کے دلوں میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس کیفیت کو وہ رس کا نام دیتے ہیں اور رس کی آٹھ قسمیں گناتے ہیں جو ہیں: محبت، نفرت، بہادری، غصہ، خرافت، خوف، حیرت اور غم۔ ارسطو ڈرامے کے لیے ۱۔ قصہ، ۲۔ کردار، ۳۔ مرکزی خیال، ۴۔ مکالمہ، ۵۔ موسیقی اور اسٹیج کی آرایش کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

ڈراما ادب کی ایک صنف ہے لیکن ایک معاملے میں ادب سے بالکل الگ بھی ہے۔ ادب لفظوں کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا لیکن ڈراما ایسا ہوسکتا ہے جس میں ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا گیا ہو بلکہ اشاروں سے کام چلایا گیا ہو۔ ڈراما الفاظ سے نہیں، عمل سے بنتا ہے۔ اسی لیے ارسطو نے ڈرامے کو عمل کی نقل کہا ہے۔ وضاحت ضروری ہو تو ہم عرض کرسکتے ہیں کہ ڈراما زندگی کی ایسی نقل ہے جو اداکاروں کے ذریعے دیکھنے والوں کے سامنے

www.urduchannel.in

اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ بالکل سچی اور اصلی معلوم ہو۔

اردو کے اوّلین ڈرامے

اردو کے اوّلین ڈرامے لکھنؤ میں لکھے اور اسٹیج پر پیش کیے گئے۔ لکھنؤ کی رنگ رلیاں، اہل لکھنؤ کی عیش پسندی اور واجد علی شاہ کی جدّت پسند طبیعت ان ڈراموں کے وجود میں آنے کا سبب ہوئیں۔ بے شک یہ ڈرامے فن کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اس لیے بعض اہل نظر نے انھیں ڈراما تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی چیز پہلی بار وجود میں آتی ہے تو وہ ہر لحاظ سے مکمل نہیں ہوتی بلکہ اس میں طرح طرح کی خامیاں ہوتی ہیں۔ یہی حال ان ڈراموں کا ہے۔

واجد علی شاہ کے رہس : واجد علی شاہ کے لکھنؤ میں ہر طرف ناچ گانے کے چرچے تھے۔ اہلِ لکھنؤ کی عیش پسند طبیعت دل بہلانے کے نت نئے سازو سامان ڈھونڈتی رہتی تھی۔ خود اودھ کے تاجدار واجد علی شاہ کو فنونِ لطیفہ سے بہت دلچسپی تھی۔ انھیں طرح طرح کے تفریحی مشاغل ایجاد کرنے کا شوق تھا۔ ہمارے کلچر میں کرشن لیلا، سوانگ، بہروپ، نقالوں اور بھانڈوں کے تماشے کی روایت پہلے سے موجود تھی۔ اِس لیلاؤں کے نمونے پر واجد علی شاہ نے خود متعدد رہس ترتیب دیے۔ رادھا اور کرشن کے قصّے پہلے ہی مشہور تھے۔ ان کی بنیاد پر واجد علی شاہ نے دو مختصر ڈرامے لکھے جنھیں "رادھا اور کنھیا کا قصّہ" نام دیا گیا۔ واجد علی شاہ نے اپنی کئی مثنویوں کو بھی ڈرامے کی شکل دی اور ہر مثنوی کو کئی مناظر میں تقسیم کیا۔ ہر رات ایک منظر اسٹیج پر پیش کیا جاتا تھا۔

واجد علی شاہ نے ایک رہس خانہ بنوایا۔ اس میں مختلف پارٹ ادا کرنے کے لیے حسین لڑکیاں ملازم رکھی گئیں۔ سازندے، گویّا، ایکٹروں کو ہدایت دینے والے اچھے اچھے [illegible] خانے میں نوکر رکھے گئے۔ طرح طرح کے لباس و زیورات تیار کرائے گئے۔ واجد علی شاہ کو اس میں اتنی دلچسپی تھی کہ روزانہ کئی گھنٹے رہس خانے میں گزارتے تھے اور کام کرنے والوں کو ضروری ہدایات دیتے تھے۔

شاہی رہس خانے کے ڈرامے عام رعایا کے لیے نہیں تھے۔ صرف خواص ہی ان سے لطف اندوز ہو سکتے تھے لیکن یہ ڈرامے اتنے پسند کیے گئے کہ ان کی شہرت محلات سے باہر پہنچی اور رعایا بھی اپنا شوق پورا کرنے کے لیے بیتاب ہو گئی۔

امانت کی اندر سبھا : شاہی رہس کی شہرت سن کر اور اہلِ لکھنؤ کے شوق کو دیکھ کر آغا حسن امانتؔ کے دل میں ایک تماشا ترتیب دینے کا خیال آیا۔ مثنوی سحرالبیان اور مثنوی گلزارِ نسیم اس زمانے میں بہت مقبول تھیں اور جلسوں میں سنائی جاتی تھیں۔ ان مثنویوں کے عشق سے لبریز قصّے امانت کے سامنے تھے۔ شاہی رہس کے قصّے سن سن کر انھوں نے یہ بھی جان لیا تھا کہ کسی قصّے کو کس طرح اسٹیج پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے "اندر سبھا" کے نام سے ایک قصّہ ترتیب دیا۔ ناقدین نے اسے اردو کا پہلا باضابطہ ڈراما تسلیم کیا ہے۔

اندر سبھا کا قصّہ مختصراً یہ ہے کہ راجا اندر اپنا دربار سجاتا ہے۔ جہاں بہت سی پریاں اپنے ناچ گانے سے راجا کا دل بہلاتی ہیں۔ سبز پری گلفام نام کے ایک شہزادے پر عاشق ہو جاتی ہے۔ راجا اندر خفا ہو کر گلفام کو کنویں میں قید کرا دیتا ہے اور پری کے پر کٹوا کے دربار سے نکلوا دیتا ہے۔ وہ جوگن بن کر ہر طرف درد بھرے گیت گاتی پھرتی ہے۔ راجا شہرت سن کر اسے بلواتا ہے۔ گانا سن کر خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے مانگ کیا انعام مانگتی ہے۔ وہ انعام میں گلفام کو مانگ لیتی ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ جوگن دراصل سبز پری تھی۔ آخر اس کا قصور معاف ہوتا ہے۔ گلفام رہا کر دیا جاتا ہے۔ آخرکار عاشق و معشوق کے ملاپ پر قصّہ ختم ہوتا ہے۔

اندر سبھا ۱۸۵۲ء میں لکھی گئی اور ۱۸۵۴ء میں کھیلی گئی یعنی اسٹیج پر پیش کی گئی۔ امانت

www.urduchannel.in

نے کوئی ڈراما دیکھا نہیں تھا۔ شاہی رہس کے بارے میں انھوں نے صرف سنا تھا لیکن داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے غور و فکر سے کام لیا اور ایک صنف کو جس کے باقاعدہ جلد وہ خود ہی ہیں اپنے قدموں پر کھڑا کر دیا۔ انھوں نے تخیل سے کام لے کر بہت سی دشواریوں کا حل ڈھونڈ لیا مثلاً شہزادہ گلفام کو کنویں میں ڈالا جانا کس طرح دکھایا جاتا۔ گلفام کو لے جا کر اسٹیج کے ایک کونے میں بٹھا دیا جاتا ہے اور ناظرین سمجھ لیتے ہیں کہ اسے کنویں میں ڈال دیا گیا۔ آخر میں ایک ایکٹر اس کے نزدیک جاتا ہے اور ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گلفام کو کنویں سے نکال لیا گیا۔

اندر سبھا میں گانے بہت زیادہ ہیں اور عوام کی پسند کے عشقیہ گانے ہیں۔ دراصل امانت نے ہر معاملے میں عوام کی پسند کو ذہن میں رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈراما ہر طرف مقبول ہو گیا۔ اندر سبھا کے جواب میں کئی اندر سبھائیں لکھی گئیں اور آخر کار ہر ڈرامے کو اندر سبھا کہا جانے لگا۔ ڈراما لکھنؤ سے نکل کر دوسرے شہروں بلکہ دیہات تک میں پہنچ گیا اور بہت سی ناٹک کمپنیاں قائم ہو گئیں۔

ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں: "اندر سبھا جب لکھنؤ میں کھیلی گئی تو لوگوں نے اس نئی چیز کو بہت پسند کیا۔ ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا۔ اس نے ہمارے ڈرامائی ادب کو اسٹیج کا راستہ دکھایا اور وقت کی شاہراہ پر ایسی مشعل جلائی جس کی روشنی میں اردو ڈرامے اور تھیٹر کا کارواں چل پڑا۔"

دورِ عروج

ایک طرف تو امانت کے ڈرامے "اندر سبھا" نے اور دوسری طرف مغربی اثرات نے ڈرامے کو مقبولیت عطا کی۔ بمبئی اور گوا جیسے شہروں میں مغربی باشندے بھی بڑی تعداد

میں موجود تھے۔ وہ ڈرامے کی انگریزی روایت سے واقف تھے۔ ان میں ڈرامے کی مقبولیت بالکل فطری بات تھی۔

اردو ڈراما بمبئی میں: جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے بمبئی تھیٹر کے نام سے ایک کمپنی قائم کی۔ یہاں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ڈرامے پیش کیے گئے۔ اردو ڈراما "راجا گوپی ناتھ اور جلندھر" بھی اس کے اہتمام میں دکھایا گیا۔ اب اسٹیج پر سامنے کا پردہ بھی لگایا گیا اور پیچھے کا پردہ جو سادہ ہوتا تھا اس پر مختلف مناظر نقش کر دیے گئے۔ بمبئی میں پارسیوں نے اپنی منڈلیاں بنائیں اور قدیم ایرانی قصوں کو فارسی زبان میں پیش کیا۔ ڈراما مقبول ہوا تو اس نے نفع بخش کاروبار کی شکل اختیار کر لی۔ سازندے، گویے، اداکار اور ان کے ساتھ مصور، بڑھئی اور درزی ملازم رکھ کر بڑے پیمانے پر ڈرامے کی پیش کش کا اہتمام ہوا۔

کچھ عرصہ بعد ڈرامے کی دنیا میں انقلاب آ گیا۔ اب ایسی مشینیں ایجاد ہو گئیں جن کی مدد سے حسبِ ضرورت ڈرامے کے منظر بدلے جاتے تھے اور طرح طرح کے جادوئی تماشے دکھائے جاتے تھے مثلاً دیو اڑتے ہوئے آتے تھے اور پری کو اٹھائے جاتے تھے۔ یہ سب کچھ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی اور وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی کی کوششوں سے ہوا تھا۔ اسی زمانے میں بے نظیر و بدرِ منیر، بکاؤلی، سکنتلا، جان عالم، انجمن آرا، نل دمینتی، شیریں فرہاد جیسے مشہور قصوں کو ڈراموں کی شکل دی گئی۔

ڈرامے کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ ڈراموں کی کمپنیاں اپنے ساز و سامان کے ساتھ ملک کے مختلف علاقوں میں جا کر ڈرامے اسٹیج کرنے لگیں۔ ان کی دیکھا دیکھی اور بہت سی کمپنیاں قائم ہو گئیں۔ ایک تبدیلی اور رونما ہوئی۔ ابتدائی زمانے کے ڈراموں میں شاعری کا اتنا زور تھا کہ مرثیے بھی منظوم ہوتے تھے۔ اب نثر کی طرف توجہ ہوئی۔

اس دور کے جن مصنفوں نے ڈراما نگاری کی طرف توجہ کی ان کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جاتا ہے:-

www.urduchannel.in

احسن لکھنوی : مہدی حسن احسن لکھنوی (ولادت ۱۸۵۹ء، وفات ۱۹۳۰ء) اردو شعر و ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ایک تعلیم یافتہ باذوق خاندان

آغا حشر کاشمیری : آغا حشر کاشمیری کی ولادت ۱۸۸۹ء میں اور وفات ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۰۱ء سے ڈرامے لکھنے شروع کیے اور بہت کم عرصے میں اتنی شہرت کمالی۔ بچپن سے انھیں ڈرامے سے اتنی دلچسپی تھی کہ بنارس

www.urduchannel.in

عوام کو خوش کرنے کے لیے وہ اپنے ڈرامے میں کسی نہ کسی طرح ظریفانہ ماحول ضرور پیش کرتے تھے۔ اکثر ڈراموں میں اصل قصے کے پہلو بہ پہلو کوئی مزاحیہ پلاٹ بھی چلتا ہے اور مرکزی قصے سے غیر متعلق ہوتا ہے۔ زمانے کی طلب کے مطابق فقرہ بازی، نوک جھونک، شوخی و شرارت ان کے ڈراموں میں ضرور جگہ پاتی ہے۔

ان کے مشہور و مقبول ڈرامے ہیں: صید ہوس، مار آستین، اسیر حرص، میٹھی چھری، سفید خون، شام جوانی، آنکھ کا نشہ، دل کی پیاس، یہودی کی لڑکی، خوبصورت بلا۔

⁂

آغا حشر کے زمانے میں ڈراما اور اسٹیج کی جو خصوصیات تھیں ان کا ذکر ڈاکٹر مسیح الزماں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ اسے مختصر طور پر یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

اس وقت اسٹیج پر مختلف پردوں کا رواج تھا جو آگے پیچھے لگا دیے جاتے تھے اور گراری کے ذریعے حسب ضرورت اوپر اٹھائے یا نیچے گرائے جاتے تھے۔ ان پردوں پر تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ اس طرح کا اسٹیج "پکچر فریم اسٹیج" کہلاتا تھا کیوں کہ دور سے دیکھنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اداکار تصویر کے فریم کے درمیان کام کر رہے ہیں۔

ناٹک کمپنیاں مختلف شہروں میں دورے کرتی رہتی تھیں۔ جن شہروں میں تھیٹر ہال بنے ہوئے تھے وہاں ہالوں میں، ورنہ خیمے یا شامیانے لگا کر تماشا دکھایا جاتا تھا۔ اسٹیج تین چار فٹ اونچا ہوتا تھا۔

اسٹیج کے آگے ناظرین یعنی تماش بینوں کی طرف بیٹھ کر کے سازندے بیٹھتے تھے۔ سازوں میں سارنگی، ہارمونیم اور طبلے ہوتے تھے۔ آغا حشر نے سارنگی کا رواج ختم کر دیا تھا۔

ناظرین کو اگر کوئی گانا پسند ہوتا اور وہ اس کی فرمایش کرتے تو ڈرامے کے تسلسل کا خیال کیے بغیر وہ گانا دوبارہ سنوا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح فرمایش پر کسی منظر کا دوبارہ دکھانا بھی ممکن تھا۔

جنگِ عظیم کے بعد بڑے شہروں میں گھومنے والے اسٹیج لگا دیے گئے تھے۔ ان کی شکل ایک گول تھالی کی سی ہوتی تھی اور یہ محور یعنی کیلی پر گھومتے تھے۔ ایک حصے پر تماشا دکھایا جاتا تھا اور جو حصہ پیچھے ہوتا تھا تھیٹر کے کارکن اس پر اگلے سین کی تیاری کرتے رہتے تھے۔ جب منظر بدلتا تو اسٹیج کا وہ حصہ گھوم کر سامنے آجاتا تھا۔ اس طرح منظر کے بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔

ڈرامے کے آغاز میں ایک کورس (اجتماعی گانا) ضرور ہوتا تھا جس سے ڈرامے کے قصے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔

⁂

اب ان فن کاروں کا ذکر کیا جاتا ہے جو آغا حشر کے بعد ابھرے اور جنھوں نے اردو ڈرامے پر گہرا نقش چھوڑا۔

احمد شجاع: حکیم احمد شجاع کی ولادت ۱۸۹۳ء میں اور وفات ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔ وہ کوئی بہت بلند پایہ ڈراما نگار تو نہیں تھے مگر ڈرامے میں کچھ تبدیلیاں ضرور ان سے یادگار رہیں۔ وہ رسالہ ہزار داستان کے مدیر تھے اور زبان پر اچھی گرفت رکھتے تھے۔ ان کا ڈراما "باپ کا گناہ" اتنا مشہور ہوا کہ کچھ رسالوں میں اس کے بعض مناظر شایع ہوئے۔ آخری فرعون، بھارت کا لال، دلہن، جانباز اور حسن کی قیمت ان سے یادگار ہیں۔

محمد عمر نور الٰہی: محمد عمر اور نور الٰہی الگ الگ دو مصنف ہیں مگر انھوں نے باہمی تعاون سے کئی ڈرامے لکھے اس لیے ان کے نام ساتھ ساتھ لیے جاتے ہیں۔ انھوں نے ڈرامے کی دنیا میں بہت سی قابلِ ذکر تبدیلیاں کیں۔ انھوں نے جدید طرز کے ڈرامے لکھے اور کچھ ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا ان میں جان ظرافت، ظفر کی موت اور تین ٹوپیاں قابلِ ذکر ہیں۔ "روحِ سیاست" میں ابراہیم لنکن کی زندگی کے بعض اہم واقعات پیش کیے گئے ہیں۔

www.urduchannel.in

عابد حسین : ڈاکٹر سید عابد حسین اردو کے اہم مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے اسلامی تہذیب کی تاریخ پر قابلِ قدر کام کیا ہے، کئی اہم کتابیں تصنیف کی ہیں اور جرمن شاعر گوئٹے کے "فاؤسٹ" کا بہت رواں زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ یہاں ان کی ڈراما نگاری کے بارے میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔ ان کے ڈرامے "پردۂ غفلت" کو بہت قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

پردۂ غفلت ۱۹۲۵ء میں پہلی بار برلن (جرمنی) سے شایع ہوا۔ اس میں اسلامی معاشرت کی بالکل حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ڈرامے کی تصنیف کا اصل مقصد اس بحران کو پیش کرنا ہے جس سے زمیندار طبقے کو پہلی عالمی جنگ کے بعد گزرنا پڑا۔ الطاف حسین پرانی وضع کے زمیندار ہیں۔ اپنی شان کو قائم رکھنے کے چکر میں ان کی ساری جائیداد مہاجن کے قبضے میں چلی جارہی ہے۔ ان کی بیوی ان سے زیادہ پرانے خیالات کی ہے۔ بیٹی سعیدہ نئے خیال کی لڑکی ہے جو پردے کی مخالف ہے۔ پورے ڈرامے میں شیخ جی کا کردار ایسا ہے جو حالات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دراصل ڈرامے میں قدیم وجدید کی کشمکش دکھائی گئی ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ جو لوگ وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے اور حالات کے ساتھ بدلنا پسند نہیں کرتے وہ آخرکار برباد ہوجاتے ہیں۔

اشتیاق حسین قریشی : ان کے ڈرامے اصلاحِ معاشرت کے مقصد سے لکھے گئے۔ اس لیے ان کے ڈراموں پر ایک خشک سنجیدگی حاوی ہے۔ اکثر تو وہ پند و نصیحت اور سیدھی سادی لکچربازی پر اتر آتے ہیں جس سے فن بری طرح مجروح ہوجاتا ہے۔ ان کے ڈراموں میں زبان کا لطف شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ وہ سادہ سلیس زبان استعمال کرتے ہیں جو قاری یا سامع کے ذہن پر بوجھ نہیں بنتی۔ ان کے مقبول ڈرامے ہیں گناہ کی دیوار، معلم اسود، صید زبوں اور ہمزاد۔

امتیاز علی تاج : تاج کی ولادت ۱۹۰۰ء میں اور وفات ۱۹۷۰ء میں

ہوئی۔ وہ ایک معروف انشا پرداز ہیں۔ ان کے ڈرامے اردو میں بہت مقبول ہوئے۔ ان میں گونگی جورو، چچا چھکن، کمرہ نمبر ۵ اور انارکلی بہت مقبول ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول انارکلی ہوا۔ یہ پہلی بار ۱۹۳۱ء میں شایع ہوا اور اس کی شہرت ملک میں ہر طرف پھیل گئی۔ یہ شہزادہ سلیم اور ایک کنیز انارکلی کی داستانِ معاشقہ ہے۔ مغل تاجدار اکبر اور کنیز دل آرام اس معاشقے کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور اس سے ڈرامے میں کشمکش پیدا ہوتی ہے۔

اس ڈرامے کی سب سے بڑی خصوصیت شاہی محل اور شاہی دربار کی کامیاب اور مکمل تصویر کشی ہے۔ محل کے اندر کی رقابتیں اور دربار کی سازشیں، مغل بادشاہ کا رعب اور اس کی شان و شوکت بڑی کامیابی کے ساتھ ڈرامے میں پیش کیے گئے ہیں۔

ڈرامے کا پلاٹ بہت چست اور گٹھا ہوا ہے۔ بات سے بات پیدا ہوتی ہے اور تمام واقعات پوری طرح ایک دوسرے سے مربوط ہوجاتے ہیں۔ مکالمے بھی بہت برمحل ہیں۔ ڈرامے کی زبان ادبی اور رنگین ہے۔ مصنف کی شروع سے آخر تک یہ کوشش رہی ہے کہ ڈراما انارکلی ایک ادبی شاہکار بن جائے۔ اس مقصد میں انھیں کامیابی تو حاصل ہوئی لیکن اس سے ڈرامے میں ایک خامی بھی پیدا ہوگئی وہ یہ کہ مکالمے لمبے ہوگئے۔ ڈرامے میں عمل کم اور گفتگو زیادہ ہے۔

ڈرامے میں دل آرام اور ثریا کے کردار بہت جاندار ہیں۔ انارکلی سے پہلے دل آرام اکبر کی منظورِ نظر تھی۔ انارکلی کے آجانے سے اسے اپنی جگہ چھنتی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ انتقام پر کمربستہ ہوجاتی ہے۔ محل اور دربار میں ایسا جال بچھایا جاتا ہے کہ اکبر انارکلی کی جان کے درپے ہوجاتا ہے اور آخرکار اسے دیوار میں چنوا دیتا ہے۔ انارکلی تین ایکٹ کا ایک حزنیہ ڈراما ہے جو فنی نقطۂ نظر سے بہت دلکش ہے۔ جب سے یہ ڈراما لکھا گیا ہے اس وقت سے لے کر آج تک ہر دور میں یہ بے حد مقبول رہا۔

www.urduchannel.in

محمد مجیب : پروفیسر محمد مجیب نے کم لکھا ہے لیکن بہت اچھا لکھا ہے۔

پروفیسر محمد مجیب ایک عرصے تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر رہے۔ دہلی کی تعلیمی علمی اور ثقافتی زندگی میں انھوں نے نہایت اہم رول ادا کیا۔ اردو ادب میں وہ ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کا ڈراما "کھیتی" قومی اصلاح کے مقصد سے لکھا گیا ہے۔ یہ ایک دلچسپ ڈراما ہے۔ اس میں عبدالغفور کا کردار خاص طور پر اہم ہے لیکن جس ڈرامے نے بہت شہرت پائی وہ "خانہ جنگی" ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ مغل شہنشاہ شاہجہاں کی زندگی میں ہی دو شہزادوں دارا اور اورنگ زیب کے درمیان رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ دو مختلف نظریات کی کشمکش ہے۔ ایک طرف وہ گروہ ہے جو مذہب کی ظاہری پابندیوں پر سختی سے عمل کرتا ہے۔ دوسری طرف وہ گروہ ہے جو تمام مذاہب کا یکساں احترام کرتا ہے۔ سرمد ایک بزرگ صوفی ہیں جو اپنے خیالات کی پاداش میں پھانسی پر چڑھا دیے جاتے ہیں۔

"خانہ جنگی" پانچ مناظر کا ایک المیہ ڈراما ہے۔ اس میں دو اشخاص کے درمیان ہی نہیں بلکہ دو متضاد نظریات کے درمیان تصادم دکھایا گیا ہے۔ ڈرامے کا اختتام اس طرح ہوتا ہے کہ قاری حالات کی ٹریجیڈی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

دوسرے ڈراما نگار

جن ڈراما نگاروں کا مختصر تعارف اوپر گزرا ان کے علاوہ بھی بہت سے مصنفین اس طرف متوجہ ہوئے لیکن انھوں نے تمام تر توجہ اس صنف پر مرکوز نہیں کی۔ پریم چند کا "کربلا" مائل دہلوی کی "جھانسی کی رانی"، چکبست کا "کملا"، عبدالماجد کا "زود پشیماں"، برج موہن دتاتریہ کیفی کا "راج دلاری" اور "مراری دادا"، فضل الرحمٰن کا "حشرات الارض"، کرشن چندر

[illegible] خواجہ احمد عباس کا "گلاب کی واپسی" اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

ڈاکٹر نجیب الرحمٰن، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر محمد حسن، ساغر نظامی، منور لکھنوی، شمیم حنفی، اور رضیہ سجاد ظہیر نے بھی ڈرامے کی طرف توجہ کی۔ مجنوں گورکھ پوری نے شیکسپیر کے ڈرامے کو اردو میں منتقل کیا۔

ڈرامے کا زوال

بیسویں صدی کا پہلا چوتھائی حصہ گزرنے کے ساتھ ہی ڈرامے کا زوال ہو گیا۔ ریڈیو اور فلم نے عوام و خواص کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ ایک عالمی سانحہ ہے اور صرف ہندوستان تک محدود نہیں۔

ریڈیائی ڈرامے کے تقاضے مختلف ہیں۔ یہاں نظر کچھ نہیں آتا صرف آواز کے تاثر سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ تصور اتنا بھرپور اور ایسا کارگر ہوتا ہے کہ ریڈیو سننے والا چشم تصور سے سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ ریڈیو کے بعد فلم نے تھیٹر کی جگہ لے لی۔ اسٹیج کے مناظر دور بیٹھے ہوئے ناظرین کو صاف دکھائی نہیں دیتے لیکن فلم میں کلوز اپ کے ذریعے باریک سے باریک شے اصل سے کئی گنی بڑی ہو کر دیکھنے والے کے نزدیک آجاتی ہے۔ ہال میں بیٹھا ہوا ہر آدمی مشینوں کے ذریعے ایک ایک حرف صاف سن لیتا ہے۔ ڈرامے میں ایک دشواری یہ ہے کہ اسٹیج پر چھوٹی سی غلطی بھی ہو جائے تو سب اسے دیکھ لیتے ہیں۔ فلم کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر کوئی منظر ٹھیک سے نہیں فلمایا گیا یا اس میں کوئی غلطی ہو گئی تو اس سین کو دوبارہ لے لیا جاتا ہے۔ پردۂ فلم پر جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل ہوتا ہے۔

اب ٹیلی وژن کا رواج ہے اور تقریباً ہر گھر تک اس کی رسائی ہے۔ ٹیلی وژن کو فلم ہی کہنا چاہیے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فلم دیکھنے کے لیے آپ کسی ہال میں جاتے ہیں، اب

www.urduchannel.in

ٹی وی کے ذریعے فلم آپ کے گھر آجاتی ہے۔ ان وسائل نے تھیٹر اور ڈراما کو بیٹھے دھکیل دیا ہے لیکن یہ سب مانتے ہیں کہ تھیٹر ایک فن ہے اور اسے پنپنے کا موقع ملنا چاہیے۔ آزادی سے پہلے بھی اس طرف توجہ کی جارہی تھی۔ آزادی کے بعد اس توجہ میں اضافہ ہوگیا۔ ملک کی یونیورسٹیاں اس فن کو فروغ دینے کے لیے مسلسل کوشش کر رہی ہیں۔ بیگم قدسیہ زیدی اور حبیب تنویر نے اس میدان میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ ان کی کوشش سے دہلی میں ہندستانی تھیٹر کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا جس نے سہراب اور رستم، مٹی کی گاڑی، شکنتلا، خالد کی خالہ، گڑیا گھر، مدرا راکشس وغیرہ ڈرامے پیش کیے۔

کملا دیوی چٹوپادھیائے کی تھیٹر کی انجمن "بھارتیہ ناٹیہ سنگھ" بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ حکومت ہند نے ۱۹۵۲ء میں سنگیت ناٹک اکاڈمی کے نام سے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا۔ اس کے مقاصد میں ناٹک کو فروغ دینا بھی شامل ہے۔ یہ کام اس کی شاخ "نیشنل اسکول آف ڈراما" انجام دیتی ہے۔ ملک کے تمام حصّوں میں اس قسم کی کوششیں جاری ہیں۔ یہ سب درست مگر فلم اور ٹی وی کے ہوتے ہوئے تھیٹر کا فروغ مشکل نظر آتا ہے۔

---

(۸)

خاکا

خاکا نثری ادب کی ایک دلکش صنف ہے۔ اس کا آرٹ غزل اور افسانے کے آرٹ سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ مراد یہ کہ افسانہ و غزل کی طرح یہاں بھی اشارے کنایے سے کام لیا جاتا ہے کیوں کہ اختصار اس کی بنیادی شرط ہے۔ خاکے میں کسی شخصیت کے نقوش اس طرح ابھارے جاتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں اجاگر ہو جاتی ہیں اور ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے پیش نظر ہو جاتی ہے۔ ایک چیز ایسی ہے جو خاکے کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ یہ کہ جس کا خاکا پیش کیا جارہا ہے اس کی کمزوریاں قاری کے دل میں اس کے لیے نفرت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا کریں اور خاکا پڑھ کر وہ بے ساختہ کہے کاش اس شخص میں یہ کمزوریاں بھی نہ ہوتیں۔

مولوی عبدالحق نے "نام دیو مالی" اور رشید احمد صدیقی نے "کندن" کا خاکہ لکھ کر یہ واضح کر دیا ہے کہ خاکے کا موضوع عظیم شخصیتیں ہی نہیں معمولی انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ اچھا برا، چھوٹا بڑا، امیر غریب، ہر طرح کے انسان کا خاکا لکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ خاکا نگار نے اسے ہر رنگ اور ہر روپ میں نزدیک سے دیکھا ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خاکا نگار کا قلم مردہ جسم میں جان ڈال دینے کے ہنر سے واقف ہو۔

خاکا نہ سیرت نگاری ہے نہ سوانح عمری۔ یہ کسی دل آویز شخصیت کی دھندلی سی تصویر ہے۔

Lightshot

www.urduchannel.in

اس میں نہ اس کی زندگی کے اہم واقعات کی گنجایش ہے نہ خاص خاص تاریخوں کی اور نہ زیادہ تفصیل کی۔ مصنف نے کسی شخص میں کچھ قابلِ ذکر خصوصیات دیکھی ہوں اور وہ انھیں دلچسپ انداز سے بیان کردے تو یہی خاکا ہے۔ مصنف نے یہ خصوصیات بچشم خود دیکھی ہوں تو کیا کہنا۔ ؔمنٹو نے "میرا صاحب" لکھ کر یہ ثابت کردیا کہ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر بھی ایک کامیاب خاکا لکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے محمد علی جناح کے ڈرائیور سے اس کے صاحب کے حالات سنے اور یہ خاکا لکھ کر ان کی زندۂ جاوید تصویر بنادی۔

آغاز و ارتقا

اردو میں باقاعدہ خاکا نگاری کا آغاز تو حال میں ہوا لیکن شعرائے اردو کے تذکروں میں اس کی جھلکیاں ضرور مل جاتی ہیں۔ میرؔ کے "نکات الشعرا"، مصحفیؔ کے "تذکرہ ہندی"، شیفتہؔ کے "گلشنِ بے خار"، قدرت اللہ قاسمؔ کے "مجموعۂ نغز" اور سعادت یار خاں کے "خوش معرکۂ زیبا" کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے لیکن مولانا محمد حسین آزادؔ کی "آبِ حیات" ایک ایسی کتاب ہے جس میں بیسیوں چلتی پھرتی اور منھ بولتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اسے تصویروں کا خوبصورت البم کہا جائے تو بجا ہے۔ اس لحاظ سے مولانا کی دوسری کتاب "دربار اکبری" بھی اہم ہے۔ انشا کی "دریائے لطافت" میں بھی چند شخصی تصویریں نظر آتی ہیں۔

عبدالحلیم شررؔ، مولوی نذیر احمد، مرزا محمد ہادی رسواؔ اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں بھی خاکوں کے نمونے نظر آتے ہیں۔ لیکن اردو خاکا نگاری کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوا۔ انھوں نے نذیر احمد کا خاکا لکھ کر اردو میں خاکا نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اور خاکے بھی لکھے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اس طرف توجہ کی۔ مختلف شخصیتوں پر وہ مسلسل مضامین لکھتے رہے جو بعد کو کتابی شکل میں شایع ہوئے۔

رشید احمد صدیقی کو بھی شخصیات سے دلچسپی رہی ہے اور انھوں نے بہت سے خاکے لکھے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ایک منصوبے کے تحت شخصیتوں کے خاکے لکھے جاتے رہے لیکن ان مصنفین کی نظر اشخاص سے زیادہ تحریک پر تھی اس لیے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی تاہم ان کی توجہ حقیقت نگاری پر رہی۔ عصمت چغتائی اور منٹو نے بھی بہت اچھے خاکے لکھے۔ اعجاز حسین، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی بھی اہم خاکا نگار ہیں۔ پاکستان میں بھی اس صنف نے خوب ترقی کی ہے۔ طفیل احمد اور مشتاق احمد یوسفی کے لکھے ہوئے خاکے بہت جاذبِ نظر ہیں۔ نثری اصناف میں خاکا نگاری بہت مقبول ہے۔ یقین ہے کہ یہ صنف برابر ترقی کرتی رہے گی۔

اہم خاکا نگار

مرزا فرحت اللہ بیگ

۱۸۳۰ء - ۱۹۴۷ء

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد کا خاکا "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" لکھ کر اردو میں خاکا نگاری کی ایسی مستحکم بنیاد ڈالی کہ اردو میں ہر طرف اس صنف کے قدردان پیدا ہوگئے۔ مرزا دہلی کے رہنے والے تھے اور دلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ عربی کے پروفیسر کے اچانک چلے جانے کے سبب انھیں اس مضمون میں رہنمائی کی ضرورت پیش آئی اور ان کی رسائی مولوی نذیر احمد تک ہوگئی۔ بلاناغہ روز ان کے یہاں پڑھنے جانے لگے۔ اس دوران مولوی صاحب کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا کہ خاکے کے لیے ضرورت سے زیادہ مواد فراہم ہوگیا۔ بہت کچھ لکھ بھی لیا مگر یہ سوچ کر پھاڑ ڈالا کہ "انجمن جمہور گھسیٹن میں نہ پڑ جاؤں۔ رہ رہ کر جوش آتا اور ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے مولوی صاحب کا انھوں نے اس اگر مگر سے نکالا اور دل کی باتوں کو حوالہ قلم کر دینے پر آمادہ کیا۔" آخر کار ۱۹۲۷ء میں یہ خاکا شایع ہوا اور ہر طرف ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

مصنف نے اس میں مرقع نگاری کا ایسا کمال دکھایا ہے کہ آج تک اہل قلم کو اس پر

www.urduchannel.in

رشک آتا ہے۔ اس میں مولوی صاحب کا ڈیل ڈول حلیہ، حرکات وسکنات، عادات واطوار اس ہنرمندی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں کہ مولوی صاحب نظروں کے آگے آکھڑے ہوتے ہیں۔ خوبیوں کے ساتھ ساتھ فرحت اللہ بیگ نے ان کی کمزوریاں بھی بے کم وکاست بیان کردی ہیں۔ خود فرماتے ہیں کہ "اب تک جو کچھ کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے وہ لکھوں گا اور بے دھڑک لکھوں گا چاہے کوئی برا مانے۔ جہاں مولوی صاحب کی خوبیوں کو دکھاؤں گا وہاں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کروں گا تاکہ اس مرحوم کی جیتی جاگتی تصویر کھنچ جائے۔" مولوی صاحب چونکہ ایک ظریف انسان تھے اس لیے ظریفانہ انداز میں ان کا خاکا بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ان کی دوسری کامیاب کوشش "دلی کا ایک یادگار مشاعرہ" ہے۔ اسے متعدد مرقعوں کا البم کہا جاسکتا ہے۔ یہ ۱۹۲۸ء میں شایع ہوا۔ انھوں نے "ایک وصیت کی تعمیل میں" کے عنوان سے مولوی وحیدالدین سلیم کا خاکا بھی خوب لکھا ہے۔

مولوی عبدالحق ۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء

اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں مولوی عبدالحق کا نام بہت اہم ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی وہ اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے اور مختلف شخصیتوں کے بارے میں لکھتے رہے۔ عام طور پر انھوں نے اس وقت قلم اٹھایا جب کسی کی وفات کی خبر ملی۔ بعد کو یہ خاکے "چند ہم عصر" کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شایع ہوئے۔

مولوی صاحب کی خاکہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے غیر اہم شخصیتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے نام دیو مالی کی بڑی جاذب نظر تصویر پیش کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ نیکی کسی کی جاگیر نہیں۔ کسی نادار اور معمولی انسان میں بھی ایسی خوبیاں ہوسکتی ہیں جو اسے زندۂ جاوید بنادیں۔ نام دیو جفاکش فرض شناس مالی تھا۔ اسے اپنے پیشے سے پیار تھا اور خدمتِ خلق سے اسے تسکین ملتی تھی۔ نور خاں کا خاکا بھی بہت دلکش ہے۔ وہ ایک

کھرے، صاف گو اور دیانتدار انسان تھے۔

مولوی صاحب نے ان خاکوں میں نہایت دیانت داری اور صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ کسی میں خوبیاں دیکھیں تو کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا۔ کہیں خامیاں دیکھیں تو بڑی بے باکی سے ان پر انگلی رکھ دی۔ مولانا محمد علی جوہر کا خاکہ بہت خوب لکھا ہے۔ ان کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر واستبداد کا پکا دشمن تھا۔ اگر کبھی اس کے ہاتھوں میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت ومروّت کا پُتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اس کے جاں نثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔"

مولوی صاحب کے خاکے اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔

رشید احمد صدیقی ۱۸۹۸ء - ۱۹۷۷ء

اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں سب سے اہم نام رشید احمد صدیقی کا ہے۔ ظرافت کے علاوہ انھوں نے اس نثری صنف کو بطور خاص اپنایا۔ ظرافت چونکہ ان کا بنیادی مزاج ہے اس لیے بیشتر خاکوں میں ظرافت موجِ تہ نشیں کی طرح کارفرما ہے۔ دوسری خاص بات یہ کہ جن شخصیتوں پر انھوں نے قلم اٹھایا ان سے گہرا تعلق رہا تھا اور ان کے لیے رشید صاحب کے دل میں بے حد احترام یا بہت پیار تھا۔ یہ جذبہ خاکوں میں جھلکتا ہے۔

رشید صاحب کے خاکوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ خاکوں کا پہلا مجموعہ "گنج ہائے گراں مایہ" کے نام سے ۱۹۳۷ء میں، دوسرا مجموعہ "ہم نفسانِ رفتہ" ۱۹۶۶ء میں، ایک طویل خاکہ "ذاکر صاحب" ۱۹۶۲ء میں شایع ہوئے۔ آشفتہ بیانی میری، شیخ نیازی اور مضامین رشید میں بھی خاکے مل جاتے ہیں۔ "خنداں" ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ایک خاکا "اقبال سہیل" شامل ہے۔

www.urduchannel.in

ان کے خاکوں میں بڑا تنوع ہے۔ ایک طرف جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی اور ذاکر حسین کے خاکے ہیں تو دوسری طرف کندن بھی موجود ہے جو آرٹس فیکلٹی میں چپراسی تھا۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "کندن مرگیا اور گھنٹے بجتے رہے۔ کندن کا جی کا گھنٹہ بجاتا تھا معلوم نہیں کب سے۔ کم و بیش تیس پینتیس سال سے۔ اتنے دنوں سے، اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہوگیا تھا کہ وہ مرجائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آجائے گا۔ طالب علمی کا زمانہ ختم کرکے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا۔ اس کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدتِ ملازمت ختم کی۔ گھنٹے کی آواز روز مرّہ کے اوقات میں ایسی گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آرہی ہو۔"

رشید صاحب کے قلم میں بڑی تاثیر ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں قاری کو ہنساتے ہیں اور جب چاہتے ہیں رلا دیتے ہیں۔ ان کے خاکے بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک کا احسان خاکہ نگاری پر بھی ہے۔ اس تحریک کے علمبرداروں کو خیال آیا کہ جن اہلِ قلم نے اس تحریک کو استحکام بخشا سلسلہ واران کے خاکے پیش کیے جائیں اور نامور اہلِ قلم یہ ذمہ داری قبول کریں۔ اس سلسلے کو "نئے ادب کے معمار" نام دیا گیا۔ سعادت حسن منٹو (از کرشن چندر)، مخدوم محی الدین (از سردار جعفری)، مجاز (از عصمت چغتائی)، دیوندر ستیارتھی (از ساحر لدھیانوی) کے خاکے لکھے گئے۔ ان میں سے منٹو اور ستیارتھی کے خاکوں کو قارئین نے بہت سراہا۔

فکر تونسوی نے "خدوخال" کے نام سے ۱۹۵۰ء میں چودہ خاکوں کا مجموعہ پیش کیا۔ فکر تونسوی خود بھی ترقی پسند تحریک سے منسلک رہے ہیں اور جن شخصیتوں کے خاکے انھوں نے لکھے ان میں سے بیشتر کا ترقی پسند تحریک سے تعلق رہا ہے۔ فکر کے یہاں ہیرو پرستی کا جذبہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔

جو مصنف ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں وہ ہمیشہ افراد کی اہمیت کو نظر انداز کرتے رہے اور تحریک ہی ان کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ اس لیے یہ اہلِ قلم خاکہ نگاری کو زیادہ فروغ نہ دے سکے۔ منٹو اور عصمت بھی اس تحریک سے وابستہ تھے مگر وہ فن کار پہلے تھے ترقی پسند بعد کو۔ اسی لیے ان کے خاکے فن کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ ان کا ذکر آگے آتا ہے۔

شوکت تھانوی

۱۹۰۵ء - ۱۹۶۳ء

اردو کے مقبول نثر نگاروں میں شوکت تھانوی کا شمار ہے مگر بسیار نویسی نے ان کو نقصان پہنچایا اور وہ اردو کو بہت بلند پایہ تخلیقات نہ دے سکے۔ انھوں نے "شیش محل" اور "قاعدہ بے قاعدہ" کے نام سے خاکوں کے دو مجموعے پیش کیے جو ۱۹۴۴ء میں شایع ہوئے۔ شوکت تھانوی اصلاً مزاح نگار ہیں۔ ان کے خاکوں میں بھی ظرافت کا رنگ جھلکتا ہے۔ عام طور پر تو اس انداز تحریر سے خاکوں میں جان پڑگئی ہے لیکن بعض جگہ ایسا بھی ہوا ہے کہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش میں سنجیدگی باقی نہ رہی اور شخصیت پوری طرح ابھر کر سامنے نہیں آسکی۔

"قاعدہ بے قاعدہ" کے مقابلے میں "شیش محل" کے خاکے زیادہ مقبول ہوئے۔ دراصل یہ زیادہ توجہ سے لکھے گئے ہیں اس لیے زیادہ جاندار اور دلچسپ ہیں۔

سعادت حسن منٹو

۱۹۱۲ء - ۱۹۵۵ء

سعادت حسن منٹو بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے خاکے بھی لکھے اور جاندار قلمی تصویریں پیش کردیں۔ وہ زبردست حقیقت نگار ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی ہو بہو تصویر اتار دیتے ہیں۔ ان کے تین مجموعے "گنجے فرشتے" ۱۹۵۲ء میں، "لاؤڈ اسپیکر" ۱۹۵۵ء میں اور "شخصیتیں" ۱۹۵۶ء میں شایع ہوئے۔ انھوں نے فلمی اور ادبی شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے۔ جانب داری اور رو رعایت کے وہ قائل نہیں۔ نظر اتنی گہری ہے کہ کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں رہتی اور قلم اتنا بے باک ہے کہ جو کچھ دیکھا ہے اسے لکھنے سے چوکتے نہیں۔ "گنجے فرشتے" کے دیباچے میں منٹو لکھتے ہیں۔ "میرے اصلاح خانے میں کوئی گھونگر

www.urduchannel.in

پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آنا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی۔ اس کے منھ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میراجی کی ذلالت پر مجھ سے استری نہ ہو سکی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا کہ وہ پر خود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔"

منٹو کی زبان میں بناؤ سنگھار نہیں ہوتا۔ وہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی تحریر میں بڑی جاذبیت ہوتی ہے۔ وہ پاکستان چلے گئے تھے لہٰذا ان کے خاکوں نے وہاں خاکہ نگاری کا ذوق پیدا کیا۔ اس صنف کو پاکستان میں جو فروغ ہوا اس میں منٹو کے خاکوں کو بھی بہت دخل ہے۔

عصمت چغتائی (۱۹۱۵ء - ۱۹۹۱ء) عصمت چغتائی نے مجاز کا خاکا "نئے ادب کے معمار" سلسلے کے لیے لکھا تھا۔ لیکن آگے چل کر انھوں نے ایک ایسا خاکا پیش کیا جسے اردو ادب کا بہترین خاکا کہا جا سکتا ہے۔ یہ ان کے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکا ہے جو "دوزخی" کے عنوان سے لکھا گیا۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے عظیم بیگ کی کوئی قابل پرستش مورتی نہیں "بنائی گئی بلکہ ان کی کمزوریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ پیدائش کے وقت سے ان کی صحت خراب تھی اور آخر تک ایسی ہی رہی۔ وہ مرزا پھوپا کہلاتے تھے۔ اس کا نفسیاتی ردعمل ہوا۔ انھوں نے یہ جتانے کے لیے کہ میں کمزور نہیں ہوں طرح طرح کی حرکتیں کیں اور خاندان میں پھوٹ ڈلوائی۔ عصمت نے ان کے کسی عیب پر پردہ نہیں ڈالا اور سب کچھ بے کم و کاست بیان کر دیا۔

عصمت نے منٹو کا بھی بہت عمدہ خاکا لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ننھی کی نانی، بچھو پھوپی، کو بھی خاکے ہی کہا جا سکتا ہے۔ دراصل ان کے خاکے میں افسانے کا اور افسانے میں خاکے کا رنگ جھلکتا ہے۔ انھوں نے باقاعدگی کے ساتھ خاکہ نگاری کی طرف توجہ نہیں کی لیکن ان کے افسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو بے شمار خاکے سر ابھارتے نظر آتے ہیں۔

اعجاز حسین (۱۸۹۸/۹۹ء - ۱۹۷۵ء) ڈاکٹر اعجاز حسین کو ہم خاکہ نگار تو نہیں کہہ سکتے لیکن انھوں نے اس صنف کی طرف توجہ کی ہے۔ انھوں نے چوالیس شاعروں کے بے حد مختصر خاکے لکھے ہیں جو کتابی شکل میں "ملک ادب کے شہزادے" کے نام سے ۱۹۵۴ء میں شایع ہوئے۔ اگر ان شخصیتوں پر ذرا تفصیل سے لکھا جاتا تو یہ خاکے اہمیت کے حامل ہو سکتے تھے۔

محمد طفیل نقوش (لاہور) کے مدیر محمد طفیل خاکہ نگار ہیں اور اس صنف کو فروغ دینے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۵۵ء میں انھوں نے نقوش کا شخصیات نمبر شایع کیا۔ ان میں بیاسی نامور اہل قلم کے خاکے شامل ہیں۔ کوشش کر کے بیشتر خاکے ان مصنفوں سے لکھوائے گئے ہیں جنھوں نے ان اصحاب کو نزدیک سے دیکھا اور سمجھا۔

عبدالمجید سالک (۱۸۹۳ء - ۱۹۵۹ء) ۱۹۵۵ء میں ہی "یارانِ کہن" کے نام سے عبدالمجید سالک کی ایک کتاب شایع ہوئی۔ اس میں بیس خاکے شامل ہیں۔ سالک ایک نامور صاحب قلم ہیں۔ ان کا انداز بیان عالمانہ اور پُر وقار ہے۔

اشرف صبوحی (۱۹۰۵ء - ۱۹۹۰ء) اشرف صبوحی دلّی کی چٹخارے دار زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ دلّی ان کے خون میں گردش کرتی ہے اور دلّی والوں کو انھوں نے اچھی طرح دیکھا اور سمجھا ہے۔ انھوں نے پندرہ خاکوں پر مشتمل ایک مجموعہ "دلّی کی چند عجیب ہستیاں" پیش کیا۔ یہ وہ گمنام شخصیتیں ہیں جنھیں زمانۂ قدیم کی یادگار کہا جا سکتا ہے اور جن کی جیتی جاگتی تصویریں اشرف صبوحی نے ان خاکوں میں اتاری ہیں۔ ان کی تحریروں میں زبان و بیان کا بہت لطف پایا جاتا ہے۔

ضیاء الدین احمد برنی (۱۸۹۰ء - ۱۹۶۹ء) ان کی کتاب عظمتِ رفتہ ۱۹۶۱ء میں شایع ہوئی۔ اس میں ترانوے شخصیات کے خاکے ہیں۔ ان شخصیات میں علماء،

www.urduchannel.in

مدرسین، سیاست داں، صحافی اور شاعر و ادیب شامل ہیں۔ ایک بات یہ کہ یہ تصویریں یک رخی ہیں جیسا کہ مصنف نے خود تسلیم کیا ہے صرف خوبیوں سے سروکار رکھا گیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں ان کی پیروی کریں۔

شاہد احمد دہلوی

۱۹۰۶ء - ۱۹۶۷ء

شاہد احمد دہلوی ایک صاحبِ طرز انشا پرداز کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ نثر نگاری پر انھیں کامل عبور حاصل ہے۔ نثر کے پارکھوں نے ان کے اسلوب کو بہت سراہا ہے۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ "گنجینۂ گوہر" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس میں سترہ خاکے شامل ہیں۔

"گنجینۂ گوہر کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس صنف سے مصنف کو فطری طور پر مناسبت ہے۔ خاکا نگاری کے مطالبات سے وہ پوری طرح واقف ہیں اور اس کے ساتھ مکمل انصاف کرتے ہیں۔ ان خاکوں میں جگر مراد آبادی، حسن نظامی، میراجی، کیف دہلوی، مرزا محمد سعید کے خاکے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی ہمارے عہد کے نامور شگفتہ نگار ہیں۔ ان کی ظرافت آمیز نثر قاری کے دل کو موہ لیتی ہے۔ چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور آبِ گم ان کی بے حد مقبول کتابیں ہیں۔ آخری دو کتابوں میں بہت سے جاندار خاکے بکھرے ہوئے ہیں۔ اینڈرسن، خاں صاحب، یعسوب الحسن غوری کے خاکے بہت دلکش ہیں۔

مختار مسعود

مختار مسعود کا قلم بہت جاندار ہے۔ ان کی عبارت میں ایک لفظ بیکار یا غیر ضروری نہیں ہوتا۔ ان کی نثر بہت شگفتہ اور رواں ہوتی ہے۔ "آوازِ دوست" اور "سفر نصیب" ان کی مقبول تصانیف ہیں۔ بے شک یہ خاکوں کے مجموعے نہیں لیکن دونوں کتابوں میں بہت سے خاکے نظر آتے ہیں جو قاری کو متوجہ کیے بغیر نہیں رہتے۔

مجتبیٰ حسین اور اطہر پرویز نے بھی خاکہ نگاری کی طرف توجہ کی۔

۹

انشائیہ

انشائیہ وہ تحریر ہے جس میں کسی اہم یا غیر اہم واقعے، کسی خیال، کسی جذبے یا محض کسی لمحاتی کیفیت کو پر لطف انداز میں پیش کر دیا گیا ہو۔ ترتیب، تنظیم، سنجیدگی، غور و فکر وہ چیزیں ہیں جن کی یہ صنف متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہلکا پھلکا خیال اور شگفتہ و ظرافت آمیز اظہار ہی اسے زیب دیتا ہے۔ انشائیہ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کی کوئی شرط نہیں، کوئی اصول نہیں۔ جو کچھ کہو اس طرح کہو کہ پڑھ کر جی خوش ہو جائے اور پڑھنے والے کے ذہن میں گدگدی سی ہونے لگے۔

وزیر آغا انشائیہ کے بارے میں فرماتے ہیں "انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر کی چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے۔ چست و تنگ کپڑے اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ مونڈھے پر نیم دراز ہو کر حقے کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے محوِ گفتگو ہو جاتا ہے۔"

انشائیہ میں حکمت و حماقت اور مقصدیت و بے مقصدیت اس طرح آپس میں گتھ جاتے ہیں کہ ان کا الگ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہاں ایک شے ایسی ہے جو انشائیہ کے آئینے میں صاف نظر آتی ہے اور وہ ہے انشائیہ نگار کا اپنا عکس۔ یہ ایک ایسی شخصی تحریر ہے جس میں مصنف کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔

www.urduchannel.in

سید محمد حسنین نے درست فرمایا ہے کہ "انشائیہ نگار کے لیے وقت انشائے خاطر خواہ مصرف لینا ضروری ہے۔ یعنی انشائیہ کی اس امتیازی خصوصیت کو قائم رکھنا اس کی ہشیاری ہے۔ ذہن میں آنے والے خیالات کو اسے آوارہ گردی اور وحشت سے بچانا چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ انھیں آزاد و خود مختار نہ چھوڑ دے۔ انھیں قابو میں رکھے۔ ان میں تسلسل اور ربط قائم کرے لیکن اس بات کا شعور بھی ضروری ہے کہ خیالات میں وہ سالمیت اور تنظیم و اتحاد پیدا نہ ہونے دے جو مقالوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔"

انشائیہ نگار

اردو میں صنف انشائیہ کا آغاز کب سے ہوا اور اردو کا پہلا انشائیہ نگار کون ہے؟ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں۔ دراصل اس بارے میں بھی اختلاف رائے ہے کہ اس صنف نے یہیں آنکھ کھولی یا اسے مغرب سے درآمد کیا گیا۔ جو علمائے ادب اسے ملکی پیداوار بتاتے ہیں وہ بھی متفق ہو کر یہ نشان دہی نہیں کر پاتے کہ انشائیہ کی خصوصیات پہلے پہل کس نثر نگار کے یہاں نظر آتی ہیں۔ بعض نے تو ملا وجہی کی "سب رس" میں اس کی اولین جھلک دیکھی ہے۔

اصلیت یہ ہے کہ انشا عالمی ادب میں بھی ایک نومولود صنف ہے اور ابھی تک اس کی خصوصیات قطعیت کے ساتھ متعین نہیں ہو سکی ہیں۔ اس لیے کسی فن پارے میں انشائیہ کی ایک خصوصیت ملتی ہے تو کسی میں دوسری خصوصیت اس لیے صحیح فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے۔ تلاش کیجیے تو "سب رس" کے بعض ٹکڑوں میں ایسی خصوصیات نظر آجاتی ہیں جن کا انشائیہ میں پایا جانا ضروری ہے مگر "سب رس" کو کسی بھی طرح انشائیہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے عہد کو انشائیہ کی صبح کاذب اور رشید احمد صدیقی کے دور کو انشائیہ کی صبح صادق کہا گیا ہے اور یہ خیال بالکل درست ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد

۱۸۳۲ء - ۱۹۱۰ء

آزاد کے قلم میں عجیب جادو ہے۔ شبلی نے کہا تھا کہ "وہ گپ بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔" آب حیات، دربار اکبری، نیرنگ خیال ان کی وہ تصانیف ہیں جن کے مختلف حصوں پر کبھی افسانے کا دھوکا ہوتا ہے کبھی خاکے کا گمان گزرتا ہے، کہیں انشائیہ کا عکس نظر آتا ہے۔ نیرنگ خیال کے شہ پاروں کو تو انشائیوں کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

عبدالحلیم شرر

۱۸۶۰ء - ۱۹۲۶ء

لکھنؤ کی زبان شرر کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ ان کی بیشتر تصانیف فکشن کے ذیل میں آتی ہیں۔ لیکن انداز بیان ایسا بے تکلف اور دلکش ہے کہ جگہ جگہ انشائیہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ "گذشتہ لکھنؤ" میں بھی اس نوعیت کے اقتباس جا بجا ملتے ہیں۔ ان کے مضامین میں ہلکے پھلکے مضمون بھی موجود ہیں جو انشائیہ کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

حسن نظامی

۱۸۷۸ء - ۱۹۴۷ء

خواجہ حسن نظامی کا شمار اردو کے صاحب طرز انشا پردازوں میں ہے۔ قلعہ معلی کی زبان خصوصاً بیگمات کی زبان پر جیسی قدرت ان کو حاصل ہے کم کو حاصل ہوگی۔ ۱۸۵۷ء کی بربادی کے بعد بیگمات قلعہ کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس کے حالات خواجہ حسن نظامی نے "بیگمات کے آنسو" میں رقم کیے ہیں۔ ان میں زیادہ تر سچے واقعات ہیں تو شاید کچھ افسانہ بھی۔ زبان بہت دلکش اور انداز بیان بہت پر تاثیر ہے۔ انھیں انشائیہ کہنا بجا ہوگا۔ گل بانو اس کی اچھی مثال ہے۔ تھینگر کا جنازہ اور گلاب تمھارا کیکر ہمارا ایسے شہکار ہیں جو انشائیہ کی کڑی سے کڑی کسوٹی پر بھی پورے اترتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

۱۸۸۳ء - ۱۹۴۷ء

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں میں ظرافت، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، لطف بیان سب گھل مل جاتے ہیں۔ انشائیہ میں ان سب کا گھل مل جانا ضروری بھی ہے۔

www.urduchannel.in

مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، دلّی کا آخری یادگار مشاعرہ، ایک وصیت کی تعمیل۔ ان تینوں خاکوں میں انشائیہ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن مضامین فرحت کی ورق گردانی کیجیے تو خالص انشائیہ نگاری کے کئی کامیاب نمونے مل جاتے ہیں۔

ملّا رموزی

۱۸۹۶ء-۱۹۵۲ء

ملّا رموزی اپنی "گلابی اردو" کے لیے مشہور ہیں۔ سیاسی مسائل سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں سیاسی معاملات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اپنی آڑ میں کہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ طنز کا نشانہ وہ خود ہیں لیکن یہ طنز ہوتا کسی اور پر ہے۔ ان کی نگارشات میں بھی انشائیہ نگاری کے متعدد نمونے مل جاتے ہیں۔ "غنودگی" اس کی اچھی مثال ہے۔

رشید احمد صدیقی

۱۸۹۸ء - ۱۹۷۷ء

رشید احمد صدیقی کی نگارشات میں انشائیہ نگاری کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ مزاح نگار تو وہ ہیں ہی لیکن ان کی تحریر میں ایسی نفاست و شگفتگی ہے اور پیچیدہ فلسفیانہ مباحث کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کر دینے کا انھیں ایسا ہنر آتا ہے کہ ان کی بیشتر تحریریں انشائیہ نگاری کے ذیل میں آجاتی ہیں۔ ارہر کا کھیت اور وکیل ان کے بیحد مقبول انشائیے ہیں۔ مغالطہ، گھاگ اور چارپائی بھی ایسے انشائیے ہیں جن کی دلکشی کبھی کم نہ ہوگی۔

پطرس بخاری

۱۸۹۸ء-۱۹۵۸ء

احمد شاہ بخاری پطرس کے مضامین ہمارے عہد میں بہت مقبول ہوئے۔ دراصل یہ مضامین کم اور انشائیے زیادہ ہیں۔ وہ سامنے کی زندگی سے کوئی موضوع انتخاب کر لیتے ہیں اور اس کے بارے میں ایسی دلچسپ اور معنی خیز باتیں کہتے ہیں کہ پڑھنے والے کو بے حد لطف آتا ہے۔ ہاسٹل میں پڑھنا، لاہور کا جغرافیہ، کتے، سنیما کا عشق ان کے عمدہ انشائیے ہیں۔ ان کے انشائیے "کتے" کو اب بھی بہت دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

٭ ٭ ٭

یہاں چند انشائیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا۔ اس فہرست میں انجم مانپوری، عبد العزیز فلک پیما، حاجی لق لق، شوکت تھانوی، رام لال نابھوی، کنھیا لال کپور کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اختر احمد اورینوی اور شاہ علی اکبر قاصد کو سید محمد حسنین نے عہد حاضر میں انشائیہ نگاری کا موجد قرار دیا ہے۔ خود حسنین عظیم آبادی کا ذکر بھی اس سلسلے میں ناگزیر ہے۔

یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت ہمارے عہد کے مشہور انشائیہ نگار ہیں یہ ذکر نامکمل رہے گا اگر مشتاق یوسفی، کرنل محمد خاں اور ابن انشا جیسے نامور اہل قلم کو نظر انداز کر دیا جائے کیوں کہ ان کی تحریروں میں بلند پایہ انشائیوں کی کمی نہیں۔

اب اس صنف کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی جا رہی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں اسے بہت فروغ حاصل ہوگا۔

---

www.urduchannel.in

۱۰

مقالہ، صحافت، رپورتاژ

عالمانہ افکار کے مدلل اظہار کے لیے جو نثری صنف وجود میں آئی وہ مضمون یا مقالہ کہلائی۔ عالمی ادب میں اس صنف کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے۔ اردو میں اس کا آغاز سرسید کا رہینِ منت ہے۔ سرسید نے مختلف موضوعات و مسائل پر غور کیا اور اپنے خیالات و افکار کو ربط و تسلسل کے ساتھ عالمانہ زبان میں پیش کر دیا۔ سرسید اور ان کے رفقا۔ حالی، محسن الملک، وقار الملک وغیرہ کے مضامین تہذیب الاخلاق میں شایع ہوتے رہے۔ یہ مضامین شعر و ادب، مذہب و سیاست اور اصلاح معاشرت سے متعلق ہوتے تھے۔ بعض مضمون نگار خاص طور پر تربیت و تعلیم کی اہمیت سے قارئین کو واقف کرانا چاہتے تھے۔

تہذیب الاخلاق کے بعد جو رسالہ ملک میں عام بیداری پیدا کرنے کا خواہش مند نظر آتا ہے اس کا نام "مخزن" ہے۔ سر عبدالقادر اس کے مدیر تھے۔ وہ اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن اور مسلمان قوم کو سربلند دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ تاریخ اسلام اور اسلام کی دیرینہ روایات پر انھیں فخر تھا۔ شاندار ماضی کو وہ از سرِ نو پیدا ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس رسالے کے مضامین اسی مقصد کے تحت انتخاب کیے جاتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، پنڈت کیفی، مولانا آزاد اور راشد الخیری اس دور کے دیگر مضمون نگار ہیں۔ مولانا حالی اور علامہ شبلی کے مضامین مقالات حالی اور مقالاتِ شبلی کے ناموں سے شایع ہو کر

مقبول ہوئے۔ شبلی کے بعد ان کے جانشین سید سلیمان ندوی نے مضمون نگاری کا سلسلہ جاری رکھا۔ فرحت اللہ بیگ اور خواجہ حسن نظامی نے بھی مضمون نگاری کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

چھاپہ خانے کی ایجاد سے صحافت کو بہت فروغ ہوا۔ اردو کے اخبارات کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اردو اخبار کے بعد اودھ اخبار (۱۸۵۸ء)، آگرہ اخبار (۱۸۶۳ء)، دبدبۂ سکندری رامپور (۱۸۶۶ء)، اودھ پنچ لکھنؤ (۱۸۷۷ء)، پیسہ اخبار (۱۸۸۶ء) کے نام قابلِ ذکر ہیں حالانکہ زبان و بیان کے اعتبار سے، اردو صحافت کے معیار کے نقطۂ نظر سے ان کا بہت اونچا درجہ نہیں لیکن بہر حال یہ اردو صحافت کا ابتدائی دور ہے اس لیے ان اخبارات کی خدمت قابلِ قدر ہے۔ آگے چل کر الہلال، البلاغ (مدیر مولانا ابوالکلام آزاد)، ہمدرد (مدیر مولانا محمد علی) زمیندار (مدیر مولانا ظفر علی خاں)، انقلاب (مدیر عبدالمجید سالک)، ہمدم (مدیر جابر دہلوی) بہت اہم ہیں۔

اہم مقالہ نگار

میر بشارت علی جالبؔ

۱۸۴۷ء - ۱۹۳۰ء

بشارت علی کا وطن دہلی تھا۔ یہیں ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی کے پڑپوتے صاحبِ عالم کی سرپرستی میں شاہزادوں کی طرح پرورش پائی۔ اردو فارسی عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی کے ایک کالج میں انگریزی کی تعلیم پائی۔ اس زمانے کے ماحول کے مطابق شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا تو اصلاح کے لیے مجروح سے رجوع کیا۔ پھر ان کی صلاح پر داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔

مطالعے کا بہت شوق تھا، رواں اور شستہ زبان لکھنے کی صلاحیت تھی۔ چنانچہ مضمون نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور جلد ہی اس میدان میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ نام شہرت کے پر لگا کے اڑا اور حکیم اجمل خاں تک پہنچا تو انھوں نے "اکمل الاخبار" کے لیے ان کا انتخاب

www.urduchannel.in

کرلیا۔ اس کے بعد منشی نول کشور نے اپنے اخبار "اودھ" کے لیے ان کو دہلی سے لکھنؤ بلایا۔ اس کے بعد ہمدرد، ہمدم اور دیگر کئی اخباروں سے وابستہ رہے۔ اس سلسلے میں مختلف شہروں میں قیام رہا۔ آخر کار اپنا اخبار "ہمت" جاری کیا۔ آخر وقت تک یہی ان کی توجہ کا مرکز رہا۔ ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

جالب کا مطالعہ وسیع تھا اور کتب بینی کا شوق تھا۔ اس لیے جس موضوع پر قلم اٹھاتے، پہلے اس سلسلے میں خوب مطالعہ کرلیتے اور اچھی طرح سوچ بچار کے بعد اپنے خیالات کو سپردِ قلم کرتے اس لیے ان کی بات میں وزن ہوتا تھا۔ دلی ان کا وطن تھا اور شاہی خاندان میں پرورش ہوئی تھی۔ اپنی کوشش سے بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ غرض زبان پر مکمل عبور تھا۔ سادہ سہل اور دلکش زبان میں اظہارِ خیال کرتے تھے۔ اس لیے ان کی تحریر دل میں اتر جاتی تھی قلم میں ایسی روانی تھی کہ صرف اداریوں پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے سوا بھی بہت کچھ لکھتے تھے۔

محمد علی جوہر

۱۸۷۹ء - ۱۹۳۱ء

محمد علی کا آبائی وطن رام پور تھا۔ یہیں ۱۸۷۹ء میں ولادت ہوئی۔ صرف دو برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ نے ایسی عمدہ تربیت کی کہ آگے چل کر انھوں نے ملک و قوم کی رہنمائی کا فرض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ اور پھر انگلستان گئے۔ ہندوستان واپس آکر وہ ریاست بڑودہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہوگئے لیکن دل کو سکون حاصل نہیں ہوا۔ ان کے دل میں ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ جوش مار رہا تھا۔ آخر ملازمت سے رخصت لے لی۔ انگریزی اخبار کے لیے مضامین لکھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور کلکتہ سے انگریزی اخبار "کامریڈ" جاری کردیا۔ اس کی زبان ایسی شگفتہ اور خیالات اتنے بلند ہوتے تھے کہ بڑے بڑے انگریز بھی اس اخبار کو پڑھتے اور سراہتے تھے۔ اس اخبار کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اسلامی ممالک میں بیداری پھیلائی اور بین الاسلامی تحریک کو فروغ دیا۔ دہلی سے انھوں نے ایک اردو اخبار "ہمدرد" جاری کیا تاکہ ملک کے اندر بھی ان کے خیالات پھیل سکیں۔

مولانا محمد علی جوہر اپنے زمانے کے زبردست مقرر اور صاحبِ قلم تھے۔ ان کی تقریریں اور تحریریں دونوں جوش سے لبریز ہوتی تھیں۔ وہ اپنی بات کو دلیلوں سے مستحکم بناتے تھے۔ اس لیے لوگ بہت جلد ان کے ہم خیال ہوجاتے تھے۔ اس لیے چوٹی کے لیڈروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے مسائل ان کی توجہ کا مرکز تھے۔ خلافت تحریک کے دوران اپنی زبان اور اپنے قلم سے انھوں نے بہت کام لیا۔

مولانا نے صحافت کا بہت اعلیٰ معیار قائم کیا۔ ذاتی مفاد، پست خیالات اور سستی جذباتیت سے انھوں نے صحافت کو دور رکھا۔ ان کی تحریروں میں شگفتگی اور جوش کے پہلو بہ پہلو شوخی و ظرافت بھی پائی جاتی ہے اور اکثر طنز کی نشتریت بھی ہوتی ہے اس لیے ان کی تحریریں بہت جاندار ہوتی ہیں۔ نامور اہلِ قلم ان کی پیروی کو باعثِ افتخار خیال کرتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو صحافت کو ذریعۂ معاش بنا سکتے تھے مگر اس سے ہمیشہ گریز کیا۔

مولانا بڑے نڈر، بے باک اور بلند حوصلہ انسان تھے۔ حکومتِ وقت پر انھوں نے بڑی بے خوفی سے اور بہت سخت الفاظ میں تنقید کی۔ اس کے بدلے انھیں قید و بند کی سختیاں بھی جھیلنی پڑیں مگر اس سے ان کے ارادے کمزور نہیں ہوئے۔ مولانا شاعر بھی تھے اور جوہر تخلص کرتے تھے لیکن اس طرف انھوں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے انگلستان گئے۔ وہاں ایک تقریر میں فرمایا کہ میں اپنے ملک واپس اسی وقت جاؤں گا جب آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ آزادی تو اس وقت ملی نہیں مگر مولانا کی بات رہ گئی کیوں کہ وہیں ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا کا انتقال ہوگیا۔ ان کی میت سرزمینِ عرب لے جائی گئی اور وہیں انھیں دفن ہونا نصیب ہوا۔ اس پر ان کا ایک شعر کتنا برمحل ہے۔

سارے جہاں کو رشک ہے جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

www.urduchannel.in

ظفر علی خاں

اردو کے بلند پایہ اہل قلم میں ظفر علی خاں کا شمار ہے۔ وہ بہت خوش گو شاعر بھی ہیں اور ایک ایسے ناول نگار بھی جس نے ہندوستانی معاشرت ۱۸۷۰ء-۱۹۵۶ء کی جیتی جاگتی تصویریں دلکش انداز میں پیش کی ہیں لیکن جس میدان میں انھیں سب سے زیادہ ناموری حاصل ہوئی وہ اردو صحافت ہے۔

وہ ۱۸۷۰ء میں سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم ہوئی ایف اے پاس کرکے علی گڑھ چلے آئے۔ بی۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد محسن الملک کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ لیکن بلند حوصلے نے اس چھوٹی سی ملازمت پر قناعت کرنے نہیں دی اور وہ سرگرم سیاست میں حصہ لینے لگے۔ شعلہ خو انسان تھے۔ لوگوں نے انھیں کوہ آتش فشاں سے صحیح تشبیہ دی ہے۔ ایسی طبیعت سیاست میں بہت راس آتی ہے۔ جلد ہی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ سیاست اور صحافت کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ ظفر علی خاں نے صحافت کا راستہ اختیار کیا۔ شعلہ بیان مقرر اور جادو نگار صاحب قلم تھے۔ سیاست و صحافت میں بہت ناموری حاصل ہوئی۔ حکومت وقت ان کی تحریروں اور تقریروں سے ہمیشہ پریشان رہی اور برابر سزائیں دیتی رہی۔ ان کی زندگی کے بہترین بارہ سال قید خانے میں گزرے۔ لمبی اور تکلیف دہ بیماری کے بعد ۱۹۵۶ء میں وفات پائی۔

ظفر علی خاں کی شہرت کا اصل مدار ان کے اخبار "زمیندار" پر ہے۔ اردو صحافت پر اس اخبار کا بڑا احسان ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین صرف سیاست سے ہی متعلق نہیں ہوتے تھے بلکہ ادب، مذہب، معاشرت، سیاست، تاریخ، تہذیب وغیرہ اس کے دائرے میں شامل تھے۔ انداز بیان نہایت پرجوش ہونے کے ساتھ متین اور پروقار ہوتا تھا۔ اس لیے قارئین اس کے گرویدہ تھے۔

ظفر علی خاں کا طرز تحریر دلکش ہوتا تھا مگر مضامین کا مطالعہ کیجیے تو فارسی عربی الفاظ کی کثرت نظر آتی ہے۔ اس سے تحریر کی دلکشی تو کم نہیں ہوتی البتہ زور میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیتے ہیں لیکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ عام انسانی تجربے سے منتخب کی جائیں۔ ان کی نثر بڑی جاندار ہوتی ہے۔ ذہانت، طباعی، شوخی، ظرافت، بذلہ سنجی اور طنز ان کے یہاں سبھی کچھ نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی بھکڑ پن پر بھی اتر آتے ہیں اور صحافت میں ایسے مقام بھی آتے ہیں جب بھکڑ پن ناگزیر ہو جاتا ہے۔

ظفر علی خاں کی شاعری بھی ان کے زمانے میں بہت مقبول تھی۔ ان کی شاعری کا موضوع اس زمانے کے حالات تھے۔ ان کی بیشتر نظموں کی حیثیت تاریخی ہے مگر بہت سی نظمیں آج بھی بہت دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "بہارستان" کے نام سے شائع ہوا۔

حسن نظامی

۱۸۷۸ء - ۱۹۵۵ء

تصوف اور ادب دونوں میدانوں میں سربلند خواجہ حسن نظامی چالیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ مریدین کی تعداد ساٹھ ہزار کے قریب ہے۔ اس سے زیادہ نام وری کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا اصل نام علی تھا۔ مگر ادب اور تصوف کی دنیا میں خواجہ حسن نظامی کے نام سے جانے گئے۔ ان کے والد کا نام حافظ سید عاشق علی تھا۔ بستی حضرت نظام الدین اولیا دہلی میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت ۱۸۷۸ء ہے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ بڑی عمر میں انگریزی سیکھنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بارہ برس کی عمر میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور پرورش کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی نے ادا کی۔ انھوں نے زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ کتب نویسی کے علاوہ کتب فروشی اور دواؤں کی تجارت کو پیشے کے طور پر اختیار کیا۔ اپنی درویشی اور لازوال تحریروں سے لاکھوں دلوں پر حکومت کی۔ صحافت میں انھوں نے ایک نرالے انداز کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۵۵ء میں وفات ہوئی۔

خواجہ حسن نظامی نے بہت کتابیں لکھیں۔ ان میں زیادہ تر کتابیں اچھوتے انداز کی ہیں۔ انگریزی میں جسے لائٹ اِیٹے یعنی ہلکا پھلکا مضمون کہتے ہیں اور جس کے لیے ہماری زبان میں ایک لفظ "انشائیہ" ایجاد کر لیا گیا ہے اس طرز پر انھوں نے بہت سے مضمون لکھے مثلاً "گلاب

www.urduchannel.in

تمھارا کیکر ہمارا" اور "جھینگر کا جنازہ" اسی طرح کے ہلکے پھلکے مزیدار مضامین ہیں۔ انھوں نے سلسلے وار خطوط لکھے۔ عنوان تھا "ان کے نام جنھیں کوئی خط نہیں لکھتا"۔ ان میں ایک خط مچھر کے نام ہے تو ایک جھینگر کے نام۔ یہ دلچسپ سلسلہ بہت پسند کیا گیا۔ "بیگمات کے آنسو" کے نام سے انھوں نے شاہی خاندان کی بربادی اور غدر کی تباہی کے حالات افسانوی انداز میں لکھے۔

خواجہ حسن نظامی کی سب سے بڑی قوت ان کا بے مثال طرزِ تحریر ہے۔ وہ سادہ دسہل زبان میں ایسی دلکشی پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کی کوئی معمولی سے معمولی کتاب اٹھائی جائے تو ختم کیے بغیر چھوڑی نہیں جا سکتی۔ ان کے انداز میں سوز و گداز اتنا ہے کہ اکثر تو پڑھنے والا اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ انھوں نے اپنے رسالے "منادی" کے ذریعے اردو صحافت کو فروغ دیا۔

سلیمان ندوی

۱۸۸۴ء - ۱۹۵۳ء

سید سلیمان ندوی کو علامہ شبلی نعمانی کے جانشین کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ شبلی کے ادھورے کام انھوں نے پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ ان کی کوششوں نے کئی علمی اداروں کو استحکام بخشا اور ان کے قلم نے اردو ادب کی گراں مایہ خدمت انجام دی۔

ولادت دیسنہ (پٹنہ) میں ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔ یہیں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ سترہ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم کے لیے ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ علامہ شبلی نے اس جوہر قابل کو پہچانا اور "الندوہ" کے نائب مدیر کی ذمہ داری سونپ دی۔ آگے چل کر وہیں مدرس مقرر ہوئے مگر جس ادارے نے ان کی سربراہی میں بہت نام پیدا کیا وہ دارالمصنفین اعظم گڈھ ہے۔ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۵۳ء میں وفات پائی۔ وفات سے تین سال قبل انھوں نے ہندوستان کی سکونت ترک کر دی تھی۔

سید سلیمان ندوی کو تاریخ اور خصوصاً تاریخ اسلام سے خاص شغف تھا۔ ان کی بیشتر تصانیف اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے زبان بھی علمی استعمال کرتے ہیں جس میں عربی فارسی الفاظ کی بہتات ہوتی ہے لیکن یہ الفاظ اس سلیقے سے استعمال ہوتے

ہیں کہ پڑھنے والے کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتے اور یہ احساس کہیں نہیں ہوتا کہ وہ قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ غالباً یہ علامہ شبلی کی تربیت کا فیضان ہے کہ مضمون کے ساتھ حسن بیان بھی قاری کو گرویدہ بنا لیتا ہے۔ ان کی زبان شگفتہ ہوتی ہے اور موضوع اہم، اسی لیے ان کی تصانیف کو قدر کی نظر سے دیکھا گیا۔ ماہنامہ معارف کے ذریعے انھوں نے علمی ذوق کو عام کیا

نصیر حسین خیال

۱۸۸۲ء - ۱۹۳۴ء

نصیر حسین خیال اردو کے بہت بلند پایہ نثر نگار تھے۔ بعض اہلِ نظر کے نزدیک وہ محمد حسین آزاد ثانی تھے اور اپنے عہد کے نثر نگاروں میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

۱۸۸۲ء میں پٹنہ (بہار) میں ولادت ہوئی۔ والد کا نام فیروز حسین خاں تھا۔ بہت کم سن یعنی تین برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دادی نے پرورش کی ذمہ داری کا فرض ادا کیا۔ مالی حالات اچھے تھے کیوں کہ اجداد آسودہ حال تھے۔ شاہانِ مغلیہ نے انھیں جاگیریں عطا کی تھیں۔ سات برس کے ہوئے تو ایک اور داغ کھایا۔ دادی بھی سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ اس کے بعد چچا اور ماموں نے پرورش کی۔ شاد عظیم آبادی ان کے ماموں تھے۔

انھوں نے اردو فارسی عربی کی تعلیم حاصل کی۔ آگے چل کر انگریزی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ علم و ادب سے طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔ ماموں کی صحبت نے اسے اور جلا بخشی۔ سترہ برس کی عمر میں ایک ادبی رسالہ جاری کیا۔ "ادیب" نام رکھا۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ میں دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔

مضمون نگار کی حیثیت سے خیال کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ وہ بول چال کی سادہ و سہل زبان لکھتے ہیں لیکن الفاظ کے انتخاب اور ترتیب پر بہت توجہ کرتے ہیں جس سے روانی اور ترنم پیدا ہوتا ہے۔ ان کا اندازِ بیان بہت دلکش ہے۔ محمد حسین آزاد کی طرح شعری وسائل کا بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہ، استعارہ اور پیکر کی ان کے یہاں فراوانی ہے۔

www.urduchannel.in

فارسی عربی الفاظ کے پہلو بہ پہلو ہندی الفاظ کا بھی استعمال کرتے ہیں مگر ایسے الفاظ چنتے ہیں جو باہم گھل مل جائیں۔ ان کی نثر کفایت لفظی کی اچھی مثال ہے۔ الفاظ کا غیر ضروری استعمال انھیں پسند نہیں۔

ابوالکلام آزاد

۱۸۸۸ء - ۱۹۸۵ء

ادب، مذہب اور سیاست میں مولانا ابوالکلام آزاد نے قابلِ رشک مقام حاصل کیا۔ خطابت و صحافت میں ان کا رتبہ بہت بلند ہے۔ ان کے مضامین اور اداریے قارئین کے دلوں میں ہلچل پیدا کر دیتے تھے۔ آزاد کی تحریریں اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

ان کا نام احمد، تاریخی نام فیروز بخت، لقب ابوالکلام اور قلمی نام آزاد تھا۔ آبائی وطن دہلی تھا مگر ولادت ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں ہوئی۔ بچپن وہیں گزرا۔ گھر کا ماحول بے حد مذہبی تھا۔ والد کے عقیدت مند ہر وقت موجود رہتے۔ ایسی فضا میں ممکن نہ تھا کہ باہر کی ہوا گھر میں داخل ہو سکتی۔ مگر احمد ایک جدید ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے۔ حافظہ نہایت غیر معمولی تھا جو نظر سے گزرتا ازبر ہو جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بارہ برس کی عمر میں عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم مکمل کر لی اور پندرہ برس کی عمر میں طلبا کے ایک حلقے کو درس دینے لگے۔

کم عمری سے سیاست و صحافت کی طرف توجہ کی۔ بیدار ذہن شعلہ بار دہن اور جوہر بار قلم رکھتے تھے اس لیے بہت جلد ہر طرف شہرت پھیل گئی۔ ملک کی آزادی ان کی زندگی کا سب سے اہم مقصد تھا۔ چنانچہ تحریکِ آزادی سے وابستہ ہو گئے۔ زندگی کا نہایت بیش قیمت زمانہ جیل میں گزرا۔ جیل ہی میں تھے کہ بیوی نے دم توڑ دیا۔ حکومت پیرول پر رہا کرنے کو آمادہ تھی مگر انھوں نے انگریزی حکومت سے کوئی رعایت حاصل کرنی گوارا نہیں کی۔ غبارِ خاطر کے خطوط قلعۂ احمد نگر کی جیل میں ہی لکھے گئے۔

ایک بار حکومت نے بغاوت کا الزام لگایا تو مولانا نے اپنے تحریری بیان میں بڑے فخر کے ساتھ اس جرم کا اعتراف کیا۔ یہ بیان "قولِ فیصل" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔

مولانا ایک طویل مدت تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔ ملک کی آزادی کے بعد وزیرِ تعلیم مقرر ہوئے۔ جدید تعلیم، سائنس اور ٹکنالوجی کے علاوہ ملک کی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے انھوں نے بہت سے کام کیے۔

مولانا نے ۱۹۵۸ء میں دہلی میں وفات پائی۔ دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیانی میدان میں سپردِ خاک ہوئے۔

"غبارِ خاطر" مولانا کے ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو انھوں نے قلعۂ احمد نگر کے زمانۂ اسیری میں اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام لکھے مگر بھیجے نہیں جا سکے۔ کہیں شعری کہیں افسانوی، کہیں علمی اور کہیں سادہ و سلیس انداز میں لکھے گئے یہ خطوط اپنی مثال آپ ہیں اور ان کی تازگی آج بھی برقرار ہے۔ مولانا نے "تذکرہ" کے نام سے اپنے خاندانی حالات لکھنے شروع کیے تھے مگر اس کی صرف ایک جلد ہی شائع ہو سکی۔ قرآن کریم کی تفسیر بھی نامکمل رہی۔ مگر یہاں خاص طور پر ان مضامین کا ذکر مقصود ہے جو الہلال اور البلاغ میں شائع ہوئے اور جنھوں نے تحریکِ آزادی کو تقویت پہنچائی۔

تحریکِ آزادی کو تقویت دینے کے لیے مولانا نے یکے بعد دیگرے دو رسالے الہلال اور البلاغ جاری کیے۔ ان میں مولانا کے اداریے اور مضامین شائع ہو کر سارے ملک میں تہلکہ مچا دیتے تھے اور انگریزوں کا ایوانِ حکومت لرز اٹھتا تھا۔ اس لیے بار بار رسالے کی ضمانت ضبط ہو جاتی تھی مگر مولانا کے پائے استقامت کو ذرا بھی جنبش نہ ہوتی تھی۔ مولانا کی تحریر اور تقریر دونوں جوش سے لبریز ہوتی تھیں۔ جملے اکثر لمبے ہو جاتے تھے مگر نہ ربط و تسلسل میں کمی آتی تھی نہ کہیں عبارت میں جھول پیدا ہوتا تھا۔ مولانا کے مضامین میں عربی فارسی الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے مگر اس سے زورِ بیان میں اضافہ ہوتا ہے۔ علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات بھی قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔ دراصل علمیت مولانا کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے اور ان کی تحریروں میں جلوہ گر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ قرآن و حدیث کے حوالے بھی جا بجا پائے جاتے ہیں جس سے ان کی نثر زیادہ

www.urduchannel.in

باوقار ہوجاتی ہے۔

مولانا ایک زبردست انشاپرداز ہیں، مختلف اسالیب پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں بہت تاثیر ہے۔

عبدالماجد دریابادی

۱۸۹۲ء - ۱۹۷۷ء

مولانا عبدالماجد دریابادی ہمارے عہد کے نامور ادیب اور صحافی گزرے ہیں، فلسفہ ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ انھوں نے فلسفے سے متعلق کتابوں کے ترجمے بھی کیے اور خود بھی کتابیں لکھیں۔ ان کے اسلوب نگارش کو بھی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا۔

عبدالماجد ۱۸۹۲ء میں دریاباد ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ یہیں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اردو فارسی اور عربی گھر پر ہی سیکھی۔ پھر سیتاپور کے ایک اسکول میں داخلہ لیا اور میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ گئے اور بی۔ اے۔ میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے والد ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ماحول سازگار تھا۔ طالب علمی کے ابتدائی زمانے سے ہی مطالعے کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ کتب بینی میں ایسا دل لگتا تھا کہ دوستوں سے ملنا جلنا بھی ناگوار ہوتا تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی مضمون بھی لکھنے لگے تھے۔ یہ مضامین اس زمانے کے اچھے رسالوں میں چھپ کر داد پاتے تھے اور مصنف کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد معاش کی فکر دامن گیر ہوئی۔ پہلے تو مضمون نگاری سے روزی کمانی چاہی مگر اس میں پوری طرح کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پھر ملازمت کی طرف متوجہ ہوئے مگر کوئی ملازمت دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ آخر کار حیدرآباد چلے گئے۔ وہیں اپنی مشہور کتاب "فلسفۂ جذبات" لکھ کر علمی حلقے میں شہرت و ناموری حاصل کی۔ اس وقت تک اردو میں فلسفے کے موضوع پر بہت کم لکھا گیا تھا۔ مولانا نے فلسفے کے موضوع پر خود بھی کتابیں لکھیں اور بعض اہم کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ مکالمات برکلے ان کا اہم کارنامہ ہے۔

مولانا کا خاص میدان صحافت ہے۔ انھوں نے متعدد اردو اخبارات کی ادارت کے

فرائض انجام دیے ان میں ہمدم، ہمدرد حقیقت قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے "صدق" کے نام سے اپنا اخبار بھی جاری کیا۔

مولانا کی تصانیف و تراجم کا مطالعہ کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ زبان پر انھیں پوری دسترس حاصل ہے۔ ترجمہ کرتے ہیں تو اس طرح کہ اس پر طبع زاد تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔ یہی ترجمے کی خوبی ہے۔ ان کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہوتی ہے۔ اس کے باوجود پوری کوشش کرتے ہیں کہ زبان کا حسن برقرار رہے۔ کہیں بولی ٹھولی کی زبان استعمال کرتے ہیں، کہیں درمیانِ عبارت میں خود ہی سوال کرتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے جاتے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے ذخیرۂ الفاظ میں ردوبدل ہوتا جاتا ہے۔ فلسفے سے خاص شغف کے باعث زبان مربوط و مدلل ہوتی ہے۔

فلسفۂ جذبات، فلسفۂ اجتماع، مکالمات برکلے ان سے یادگار ہیں۔

قاضی عبدالغفار

۱۸۸۹-۹۰ء - ۱۹۵۶ء

"لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" کے مصنف قاضی عبدالغفار اصلاً صحافی تھے۔ ان کے زورِ قلم نے کئی اخباروں کو وقار عطا کیا۔

ان کا وطن مراد آباد تھا۔ وہیں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ آئے۔ ادبی اور سیاسی شعور اسی درس گاہ میں پروان چڑھا۔ عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ پہلے مولانا محمد علی کے مددگار کی حیثیت سے "ہمدرد" (دہلی) سے وابستہ ہوئے۔ کچھ دنوں بعد دہلی سے کلکتہ چلے گئے اور وہاں سے روزنامہ "مہجور" جاری کیا۔ پھر حیدرآباد جاکر "پیغام" نکالا۔

صحافت کے علاوہ سوانح اور تاریخ سے بھی انھیں گہرا شغف تھا۔ آثار جمال الدین، حیاتِ اجمل، یادگار ابوالکلام آزاد ان کے قلم سے نکلی ہوئی مشہور سوانح عمریاں ہیں۔

ان کی عمر کے آخری ایام انجمن ترقی اردو (ہند) کی خدمت میں گزرے۔ کافی عرصے تک انجمن کے سکریٹری کی خدمت انجام دی۔ اس دوران وہ انجمن کے ترجمان "ہماری زبان"

www.urduchannel.in

کے مدیر بھی رہے۔

اپنی ذاتی زندگی میں بھی اور تصنیفی کاموں میں بھی قاضی صاحب کے یہاں بہت نفاست پائی جاتی تھی۔ لباس، خوراک، رہن سہن ہر معاملے میں وہ بہت خوش سلیقہ تھے۔ اسی طرح تحریر میں بھی نفاست کا ثبوت دیتے ہیں اور بہت سوچ سمجھ کر ایک ایک لفظ کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کی عبارت بہت ستھری اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ قاضی صاحب کی نثر نگاری کی ایک اور خصوصیت ہے۔ منتخب اشعار کا استعمال ان کے یہاں بہت ملتا ہے۔ اکثر مضامین کی ابتدا وہ کسی شعر سے کرتے ہیں اور بالعموم خاتمہ بھی شعر پر ہی ہوتا ہے۔

رپورتاژ

رپورتاژ ہمارے ادب کی ایک جدید صنف ہے جس نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے ساتھ ترقی کی۔ یہ وہی صنف ہے جسے انگریزی میں "رپورٹ ایج" کہتے ہیں۔ رپورتاژ اسی لفظ کا فرانسیسی تلفظ ہے۔

کسی واقعے کی خبر یا رپورٹ اس طرح تیار کی جائے کہ اس میں افسانے کا انداز پیدا ہو جائے یا اس میں مصنف کی شخصیت جھلک اٹھے تو یہی رپورتاژ ہے۔ اسی لیے سردار جعفری نے اسے صحافت اور افسانے کی درمیانی کڑی کہا ہے۔ بقول پروفیسر احتشام حسین رپورتاژ کو ہم واقعات کی ادبی اور محاکاتی رپورٹ کہہ سکتے ہیں۔

رپورٹ عام طور پر ایک روکھی پھیکی شے ہے جسے پڑھنا یا سننا ایک صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ اسے دلچسپ اور خوشگوار بنانے کے لیے اہلِ قلم نے اس میں افسانے کا رنگ بھرا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی روئیداد حمید اختر نے ادبی زبان اور محاکاتی انداز میں پیش کرکے اردو داں حلقے کو اس صنف سے روشناس کیا۔ اس لیے ہماری زبان میں وہی اس کے موجد کہے جاتے ہیں۔

آغاز و ارتقا

ہمارے ادب میں رپورتاژ ایک نئی نثری صنف ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں کی روئیدادیں کچھ ایسے افسانوی انداز میں لکھی گئیں کہ جلسہ گاہ، شرکا کی شخصیت، ان کا سفر اور جلسوں کی کارروائی سب چیزوں کی ایک تصویر پیشِ نظر ہو جائے۔ مقصد یہ کہ رپورٹ میں خشکی اور بے لطفی باقی نہ رہے۔ اس طرح اردو ادب میں رپورتاژ کا آغاز ہوا لیکن اس سے بہت پہلے کی ایسی تصانیف موجود ہیں جن میں رپورتاژ کی دو ایک خصوصیات کسی نہ کسی شکل میں مل جاتی ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے "دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ مشاعرے کی ایک جیتی جاگتی تصویر ابھر آتی ہے اور اسے رپورتاژ کی حدوں میں داخل کر دیتی ہے لیکن یہ ایک فرضی اور خیالی مشاعرے کی تصویر ہے جب کہ ضروری ہے کہ رپورتاژ کی بنیاد کسی اصلی واقعے پر ہو۔ اس لیے اسے رپورتاژ نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے دو لاجواب خاکے لکھے۔ ایک مولوی نذیر احمد کا اور دوسرا مولوی وحید الدین سلیم کا۔ ان دونوں میں رپورتاژ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

جارج پنجم کے جشنِ تاج پوشی کے موقعے پر کلکتہ میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی روئیداد لکھی جو "البلاغ" میں ۵ جولائی ۱۹۰۲ء کو شائع ہوئی۔ اس کا انداز افسانوی ہے اور یہ رپورتاژ کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ اردو میں لکھی گئی کئی آپ بیتیاں ہیں جن میں رپورتاژ کے عناصر جا بجا نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں میر تقی میر کی ذکرِ میر، سید علی رضا کا اعمال نامہ، حکیم احمد شجاع کا خوں بہا، جوش کی یادوں کی برات قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی اور منٹو کے خاکے بھی رپورتاژ کی متعدد خصوصیات بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح کچھ سفرنامے ہیں جن میں رپورتاژ کے عناصر نظر آتے ہیں۔ لیکن جن شہ پاروں کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ان میں کسی کو بھی مکمل رپورتاژ نہیں کہا جا سکتا۔

www.urduchannel.in

ترقی پسند تحریک کو جب ہمارے ملک میں فروغ حاصل ہوا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے باقاعدگی سے منعقد ہونے لگے تو ان جلسوں کی رپورٹیں تیار کرنی پڑیں۔ ان کی خشکی اور بے کیفی کو دور کرنے کے لیے دلکش افسانوی اور محاکاتی انداز اختیار کیا گیا یہیں سے باقاعدہ رپورتاژ کا آغاز ہوا۔ اس کا سہرا حمید اختر کے سر ہے اور اسے مقبول عام بنانے میں "نظام" بمبئی کی کوشش ناقابل فراموش ہے۔

۱۹۴۰ء میں سجاد ظہیر نے "یادیں" پیش کر کے اس صنف کو استحکام بخشا۔ پھر ۱۹۴۵ء میں منعقد ہونے والی انجمن کی کل ہند کانفرنس کی رپورٹ لکھی جو ۱۹۴۷ء میں "پودے" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس صنف کے قدم پوری طرح جم گئے۔ قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی ممتاز مفتی، شاہد احمد دہلوی، فکر تونسوی اور ابراہیم جلیس جیسے بلند پایہ فن کاروں کے ہاتھوں اس صنف کو خوب فروغ ہوا۔

رپورتاژ نگار

رپورتاژ نگاروں کی تعداد تو کم نہیں لیکن جن اہل قلم کا اس پر زبردست احسان ہے۔ ان کے بارے میں یہاں بے حد اختصار کے ساتھ یہاں ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہے۔

سید سجاد ظہیر

۱۹۴۰ء میں سجاد ظہیر کی "یادیں" شائع ہوئی۔ فلیش بیک کی تکنیک اپناتے ہوئے مصنف نے ماضی کے اہم واقعات کو بکھری ہوئی یادوں کی شکل میں پیش کیا ہے مطلب یہ کہ شعور کی رو سے کام لیا ہے۔ رپورتاژ کے لیے ضروری ہے کہ کوئی واقعہ رونما ہو تو فوراً اس کی رپورٹ لکھی جائے لیکن سجاد ظہیر نے برسوں بعد اپنے ذہن کو کریدا اور یادوں کے ذخیرے سے یہ معلومات فراہم کی۔ اس لیے بعض ناقدین اسے رپورتاژ نہیں مانتے۔

کرشن چندر

ان کا مشہور رپورتاژ "پودے" ہے۔ یہ حیدر آباد اردو کانفرنس کا سفر نامہ ہے۔ جو ادیب اس کانفرنس میں شرکت کرنے بمبئی سے حیدر آباد گئے تھے ان کا مزاج و کردار، دورانِ سفر ان کا رویہ، راستے کے مناظر، میز باتوں کی محبت اور خاطر داری سبھی کچھ اس میں موجود ہے۔ کانفرنس کے مباحثوں لطیفوں اور چشمکوں نے اس میں اور بھی جان ڈال دی ہے۔ رومانیت کرشن چندر کا مزاج ہے۔ یہ رومانیت یہاں بھی نظر آتی ہے۔ ان کا دوسرا رپورتاژ "صبح ہوتی ہے" سفر دکن کی روئیداد ہے۔ ان کا ایک اور رپورتاژ "لاہور سے بہرام گلہ تک"۔ یہ سفر نامہ بھی ہے اور رپورتاژ بھی۔ ان کے "ان داتا" میں بھی رپورتاژ کے عناصر نظر آتے ہیں۔ مگر یہ رپورتاژ کم اور افسانہ زیادہ ہے۔

قرۃ العین حیدر

ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں قرۃ العین حیدر کو بڑی شہرت و ناموری حاصل ہے لیکن ان کے قلم سے کئی بہترین رپورتاژ بھی وجود میں آئے۔ ستمبر کا چاند، گلگشت، کوہِ دماوند، دکن سا ٹھا رنہیں سنسار میں، لندن لیٹر ان کے معروف رپورتاژ ہیں۔ جاپان میں ادیبوں کے انتیسویں اجلاس کی روئیداد "ستمبر کا چاند" ۱۹۵۹ء میں پیش کی گئی۔ "گلگشت" (۱۹۷۴ء) کا محور روس اور جاپان ہے۔ "کوہ دماوند" (۱۹۷۹ء) ایک ایرانی لڑکی کے ملکہ بننے کی کہانی ہے۔ "دکن سا ٹھا رنہیں سنسار میں" دکن کی کہانی سناتا ہے۔ "لندن لیٹر" میں لندن کی زندگی افسانوی انداز میں پیش ہوئی ہے۔ ان کے رپورتاژ فنی اعتبار سے بہترین رپورتاژ کہے جا سکتے ہیں۔

عصمت چغتائی

ان کے ناول اور افسانے اردو میں بہت مقبول رہے ہیں۔ اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکا انھوں نے "دوزخی" کے نام سے لکھا جس کا شمار اردو کے بہترین خاکوں میں ہے۔ اس خاکے اور ان کے بعض افسانوں میں رپورتاژ کے عناصر نظر آتے ہیں لیکن "بمبئی سے بھوپال تک" کے عنوان سے انھوں نے ایک باقاعدہ رپورتاژ لکھا جو بہت پسند کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں بھوپال میں کل ہند اردو کانفرنس

www.urduchannel.in

منعقد ہوئی۔ اس میں شرکت کے لیے عصمت نے بمبئی سے بھوپال کا سفر کیا۔ یہ رپورتاژ اسی سفر کی یادگار ہے۔ کردار نگاری، محاکات، لطف زبان، بے باکی ـــ عصمت کی ساری خصوصیات اس میں موجود ہیں۔

ممتاز مفتی اردو فکشن نگار کی حیثیت سے ممتاز مفتی بہت معروف ہیں۔ "لبیک" ان کا رپورتاژ ہے جو سفرِ حج سے تعلق ہے۔ یہ سولہ قسطوں میں "سیارہ ڈائجسٹ" میں چھپ کر ۱۹۷۶ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ "لبیک" میں لاشعور کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ اس رپورتاژ میں جا بجا متحرک تصویریں نظر آتی ہیں۔ تشبیہیں اور استعارے بھی زیادہ تر بصری ہیں۔ بعض دوسرے رپورتاژوں کی طرح یہاں بھی سفرنامے کی خصوصیات حاوی ہیں۔

شاہد احمد دہلوی دہلی کی ٹکسالی زبان پر انھیں بہت عبور حاصل ہے۔ وہ مولوی نذیر احمد کے پوتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ لطف زبان کے سبب بہت مقبول ہوا۔ رپورتاژ کے علاوہ انھوں نے خاکے، انشائیے اور ہلکے پھلکے مزاحیہ مضمون لکھے جنھیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ وہ زیادہ تر دہلی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "دلی کی بپتا" دلی کی بربادی کی آنکھوں دیکھی کہانی ہے۔ یہ وہ کہانی ہے جس کا آغاز ملک کی تقسیم سے ہوا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کو انھوں نے خود جھیلا اور تکلیفیں اٹھاکے پاکستان چلے گئے۔ آٹھ ماہ بعد وہ اپنی ماں سے ملنے آئے اور اس شہر کا بدلا ہوا روپ دیکھا جو "دلی کی بپتا" کے دوسرے حصے "ماں" میں پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ رپورتاژ ایک دردناک واقعے سے متعلق ہے اس لیے زیادہ پُر اثر ہے۔

فکر تونسوی اردو طنز و ظرافت کی دنیا میں فکر تونسوی کا نام خاصا معروف ہے۔ "چھٹا دریا" رپورتاژ ہے لیکن طنزیہ لہجہ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کا موضوع تقسیم ملک ہے جس کے سبب سارا ملک انتشار اور سراسیمگی کا شکار ہو گیا۔

بربریت کے ساتھ ہر طرف دہشت پھیل گئی۔ "چھٹا دریا" دراصل آگ و خون کا وہ دریا ہے جو پنجاب کے پانچ دریاؤں کے درمیان ۱۹۴۷ء میں اچانک بہہ نکلا۔ بے شک یہ رپورتاژ ایک تاریخی دستاویز ہے۔

ابراہیم جلیس اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ابراہیم جلیس کا شمار ہے۔ وہ بڑی صاف ستھری زبان میں فطرتِ انسانی کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے چار رپورتاژ بھی لکھے جن کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ پہلا رپورتاژ "شہر" ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں لکھا گیا اور ہفتہ وار "نظام" میں شائع ہوا۔ حیدرآباد کی تہذیبی اور سیاسی زندگی اس کا موضوع ہے۔ "دو ملک ایک کہانی" تقسیم ملک اور حیدرآباد پر پولیس ایکشن کا چشم دید احوال ہے۔ پاکستان میں ابراہیم جلیس معتوب ہوئے اور جیل بھیجے گئے تو انھوں نے "جیل کے دن جیل کی راتیں" رپورتاژ لکھا۔ یہ انھوں نے ۲۸ فروری ۱۹۵۰ء کو لکھنا شروع کیا۔ ان کا آخری رپورتاژ "سپید اور سرخ ستارے کے درمیان" ہے۔ گہری نظر، حقیقت کا واضح بیان اور شگفتہ نگاری ابراہیم جلیس کی تحریروں کی اہم خصوصیات ہیں۔

٭ ٭ ٭

"پو پھٹے" (خدیجہ مستور)، "جب بندھن ٹوٹے" (تاجور سامری)" اور خدا دیکھتا رہا" (جمنا داس اختر)، "ایک ہنگامہ" (صفیہ اختر)، "پھول پتی ہیرے کا جگر" (انور عظیم)، "مستقبل ہمارا ہے" (عبداللہ ملک)، "امن کا کارواں" (رضیہ سجاد ظہیر)، "کہت کبیر سنو بھئی سادھو" (پرکاش پنڈت)، "شہر طرب" (شاہد مہدی)، "۵ دسمبر کی رات" (زہرہ جمال)، "اے بنی اسرائیل" (قدرت اللہ شہاب)، "قوس قزح سے فراز تک" (منظور الٰہی)، "احساس کی یاترا" (رام لعل)، "خالی ہاتھ" (عتیق اللہ) بھی قابل ذکر رپورتاژ ہیں۔

---

www.urduchannel.in

۱۱

طنز و مزاح

اردو نثر میں طنز و مزاح کا سرمایہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت قابلِ قدر ہے۔ طنز اور ظرافت کے جتنے روپ ممکن ہیں وہ سب، خواہ وہ کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں، ہماری نثر میں ضرور مل جاتے ہیں۔ اسی طرح پست اور بلند ہر سطح کے نمونے ہمارے ادب میں موجود ہیں۔ چنانچہ عوام اور خواص دونوں کی دل بستگی کے سامان کی یہاں کمی نہیں۔ مزاح کا مقصد محض لطف اندوزی ہے تو طنز میں اصلاح کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ پست درجے کا طنز کسی کو نیچا دکھانے کی غرض سے بھی وجود میں آسکتا ہے۔ ایک اور اہم بات ذہن میں رکھنے کی ہے۔ خالص مزاح اعلیٰ درجے کی چیز ہے اور قاری اس سے لطف و انبساط حاصل کرتا ہے لیکن خالص طنز۔ یعنی وہ طنز جس میں مزاح کی آمیزش نہ ہو محض دشنام بن کے رہ جاتا ہے۔

آغاز

ہماری قدیم داستانوں میں ظرافت کے اولین نمونے ملتے ہیں مگر اس ظرافت کی سطح بہت پست ہے اور اکثر پھکڑپن کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ ٹھٹھول، فقرہ بازی، گھٹیا چٹکلے، سستے قسم کی چھیڑ چھاڑ جن کی ان داستانوں میں فراوانی ہے نفاست پسند طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔ باغ و بہار میں سنجیدگی غالب ہے۔ فسانۂ عجائب کی تصنع اور قافیہ پیمائی ظرافت کو ابھرنے نہیں دیتی۔ بے شک اس

میں شگفتہ نگاری کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں مگر ہیں بہت کم۔ داستانِ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال میں ہنسنے کے موقعے نسبتاً زیادہ ملتے ہیں۔ تفریحی عناصر کی یہاں کمی نہیں۔ کلیم الدین احمد کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ "خالص ظرافت کا جو زور، جو ابھار ان داستانوں میں ہے وہ دوسری تصنیفوں میں نہیں ملتا"۔ وزیر آغا اس رائے کے شدید مخالف ہیں۔ یہ بہرحال وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان داستانوں کی طوالت کو جو چیز قابلِ برداشت بنا دیتی ہے وہ داستان کے عیاروں اور دوسرے کرداروں کی عیاریاں، چالاکیاں اور کرتب ہی تو ہیں جو ہنسنے کے بہت موقعے فراہم کر دیتے ہیں۔

غالب

اردو نثر میں ظرافت کے بہترین نمونے غالب کے خطوط میں ملتے ہیں ایک نقاد کے الفاظ میں "انھوں نے پہلی بار ہلکے ہلکے مزاح کی آمیزش سے وہ دل افروز کیفیت پیدا کر دی جو انگریزی نثر میں ایڈیشن اور اسٹیل کی تحریروں کی رہین منت ہے لیکن جس کا اردو نثر میں اس سے قبل کوئی نشان نہیں ملتا"۔ خوش مزاجی غالب کی شخصیت کا بنیادی وصف ہے۔ دل آسائی اور دل جوئی ساری زندگی ان کا شیوہ رہا۔ نجی زندگی ہو، شاعری ہو یا مکتوب نگاری ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے قلم یا زبان سے جو کچھ نکلے وہ لوگوں کو خوشی فراہم کر سکے۔

غالب کو ساری زندگی مصائب کا سامنا رہا ــــ تنگدستی، ناقدری، بیماری، دوستوں کی جدائی، غدر کی تباہ کاری ــــ ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے مزاج میں افسردگی پیدا ہو گئی لیکن اس افسردگی کو انھوں نے اپنی عالی حوصلگی، خوش مزاجی اور ضبط و تحمل سے آمیز کر دیا۔ چنانچہ ان کا تصور کیجیے تو ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ ان کے خطوں کے کچھ جملے سنیے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "لوگ روٹی کھاتے ہیں، میں کپڑا کھاتا ہوں"۔ دیکھا آپ نے غربت کی کیسی تصویر کھینچی ہے۔ سخت علالت کے دوران جسمانی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اگر اٹھتا ہوں تو

www.urduchannel.in

بے تکلف اتنی دیر میں، جتنی دیر میں قدِ آدم دیوار اٹھتی ہے" ایک خط میں فرماتے ہیں کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ دو چار دن میں پڑوسیوں سے پوچھ لینا"۔ شاقب کو یہ رنگ خط بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں "آج میرے پاس نہ ٹکٹ ہے نہ دام۔ معاف رکھنا والسلام"۔

ان مثالوں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی ہوگی کہ وہ طنز و تمسخر کا نشانہ دوسروں کو نہیں بناتے۔ اپنے اوپر آپ ہنستے ہیں۔ اس کے لیے بڑا جگر چاہیے۔ غالب کی ظرافت تند و تیز نہیں۔ ان کی تحریریں ہنساتی نہیں صرف مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہیں اور کبھی کبھی تو ذہن میں ایک گدگدی سی ہوتی ہے اور بس۔ یہ ظرافت کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔

اودھ پنچ

۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" اخبار جاری ہونے کے ساتھ ہی اردو میں طنز و مزاح کے ایک نئے اور ایک بھرپور دور کا آغاز ہوتا ہے۔ چکبست فرماتے ہیں کہ "اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ اور طرار طبیعت کا رنگ غالب سے کہیں مختلف ہے اور ان کے قلم سے پھبتیاں ایسے نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر"۔

اودھ پنچ کو دراصل وقت کا تقاضا سمجھنا چاہیے۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت خیزیوں نے لوگوں کے ہونٹوں سے ہنسی چھین لی تھی۔ مایوسی کا غلبہ تھا جس کے نتیجے میں سنجیدگی کا غلبہ ہوتا جاتا تھا۔ چنانچہ اودھ پنچ نے وہ کام کیا جو رات کی تاریکی میں آتش بازی کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی ادب خصوصاً انگریزی مزاح سے لوگ واقف ہو چلے تھے۔

انسانی کمزوریاں لوگوں کو ہنسنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ سماجی برائیاں اور اخلاقی خرابیاں "اودھ پنچ" میں لکھنے والوں کی نظر میں تھیں۔ ان کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ان کی ہنسی اڑائی گئی۔ اس طرح مذاق مذاق میں کام کی باتیں بھی ہو گئیں۔ اس اخبار کے ذریعے ملک میں

ظرافت کا ذوق عام ہوا۔ اس کے لکھنے والوں میں رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین، ترکھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق، منشی احمد علی کسمنڈوی اور نواب سید محمد آزاد قابل ذکر ہیں۔ اس کے اہم شرنگاروں کا ذیل میں بے حد مختصر تعارف کرایا جاتا ہے۔

رتن ناتھ سرشار

اودھ پنچ کے دور اول کے لکھنے والوں میں سب سے اہم نام رتن ناتھ سرشار کا ہے۔ طنز سے ان کی طبیعت کو مناسبت نہیں۔ وہ مزاح نگار ہیں مگر ان کے یہاں وہ نفاست نہیں جو غالب کی ظرافت کی خصوصیت ہے۔ ان کا مزاح عامیانہ اور پست درجے کا ہے۔ ایک ناقد کے الفاظ میں "ان کی ظرافت میں ایڈیسن کی لطافت کے بجائے والیٹر کی تیزی پائی جاتی ہے"۔ ان کے یہاں گہرائی مفقود ہے اور ان کا مدعا قاری کو ہنسانا، فوراً ہنسانا اور قہقہے لگانے پر مجبور کرنا ہے۔

لکھنؤ کی تہذیب اور لکھنؤ کی معاشرت سرشار کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ لکھنؤ کی ساری خرابیاں ان کی نظر میں ہیں مثلاً افیون کی لت، بٹیر بازی کی لعنت، وقت برباد کرنے کے لیے طرح طرح کے کھیل کود ان سب چیزوں کا سرشار خوب مذاق اڑاتے ہیں۔ خوجی کا کردار وضع کر کے فسانۂ آزاد میں انھوں نے پرانی تہذیب کی خرابیوں مثلاً اوہام پرستی، خوشامد، کاہلی، بزدلی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ آزاد کو انھوں نے نئے عہد کی علامت بنا کر اس نئے عہد کو سراہا ہے۔

سرشار کی تحریروں میں مضحکہ خیز واقعات بھی قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان سے بھی انھوں نے کامیاب طور پر ظرافت پیدا کی ہے۔ لفظی الٹ پھیر، اردو فارسی کے بے میل الفاظ کا مضحکہ خیز استعمال، لطافت، حاضر جوابی، بذلہ سنجی، پھبتی اور ضلع جگت جیسی تدبیروں سے کام لینا انھیں خوب آتا ہے۔

www.urduchannel.in

سجاد حسین

اودھ پنچ کے ایڈیٹر سجاد حسین تھے۔ اس اخبار کی کامیابی انھی کی رہینِ منت ہے۔ ان کا اپنا قلم بھی بہت جاندار ہے۔ ثبوت یہ کہ ان کی تصانیف حاجی بغلول، طرحدار لونڈی اور احمق آج بھی مقبول ہیں۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں ہندوستانی رئیسوں کے نام خطوط بھی لکھے۔ "لوکل" اور "موافقتِ زمانہ" اس اخبار کے مستقل کالم تھے جن کے ذیل سجاد حسین اپنے عہد کے حالات اور اہم واقعات پر طنزیہ اور ظریفانہ انداز میں روشنی ڈالتے تھے۔

سجاد حسین نے اپنے اخبار کے پرچم تلے اہلِ قلم کی ایک پوری جماعت کھڑی کر دی جس نے اپنی طنزیہ اور ظریفانہ تحریروں سے ملک میں دھوم مچا دی۔ اس اخبار نے کم و بیش چھتیس برس اردو ظرافت کی خدمت کی۔ اور اتنی طویل مدت تک اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں کمی نہیں آئی۔

دیگر مصنفین

مچھو بیگ بھی "اودھ پنچ" کے خاص لکھنے والوں میں سے ایک ہیں۔ وہ ستم ظریف کے فرضی نام سے کئی برس لکھتے رہے۔ ان کی زبان سادہ سلیس اور رواں ہے۔ تربھون ناتھ ہجر کو سرشارِ ثانی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بھی سرشار کی طرح اہلِ لکھنؤ کی مذموم عادتوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔ جوالا پرشاد نے مترجم کی حیثیت سے نام کیا اور اپنے عہد کے اہم مسائل پر طنزیہ مضامین بھی لکھے۔ احمد علی کسمنڈوی نے اپنے مضامین میں اس عہد کی خامیوں کا مذاق اڑایا۔ نواب محمد آزاد کی تحریروں میں ظرافت سے زیادہ طنز نظر آتا ہے اور کبھی کبھی اس میں تلخی بڑھ جاتی ہے۔

❖ ❖ ❖

اودھ پنچ اور اس کے مصنفین نے اردو طنز و مزاح کی جو خدمت انجام دی اس کا اندازہ مندرجہ بالا عبارت سے ہو جاتا ہے۔ بطورِ مجموعی ان کی نگارشات قابلِ قدر ہیں مگر خامیوں سے خالی نہیں۔ اردو میں طنز و ظرافت کی یہ ابتدائی شکل ہے اس لیے خامیوں کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ لیکن جو چیز سب سے زیادہ ناگوار ہوتی ہے وہ بغض و عناد ہے جس نے ظرافت کی سطح کو پست کر دیا۔ طعن و تشنیع، زہرناکی، عداوت، پھکڑپن یقیناً قابلِ مذمت ہے۔ سرشار، حالی، شبلی کے درمیان جو معرکہ آرائی ہوئی وہ افسوسناک ہے تاہم اردو میں طنز و ظرافت کی بنیاد مستحکم ہو گئی اور اس کے فروغ کی راہیں ہموار ہو گئیں۔

عبوری دور

اودھ پنچ اور اردو طنز و مزاح کے دورِ عروج کے درمیان ایک عبوری دور ہے جو تقریباً پچاس برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی اور بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی اس میں شامل ہے۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اہلِ قلم میں ضبط و تحمل پیدا ہوا۔ دشنام طرازی سے جہاں تک ہو سکا دامن بچانے کی کوشش کی گئی۔ زبان و بیان کے سلسلے میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ تحریروں میں ادبی رنگ پیدا ہوا اور اب اسلوب کو موضوع سے زیادہ اہم سمجھا جانے لگا۔

اس دور کے لکھنے والوں میں مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی، حسن نظامی اور قاضی عبدالغفار اہم ہیں۔ ان کے علاوہ پریم چند کے افسانوی ادب سے بھی ظرافت اور طنز کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مہدی افادی سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں اور انداز بیان میں بھی متانت سے کام لیتے ہیں مگر متانت کے باوجود ان کی تحریروں میں بہت شگفتگی پائی جاتی ہے۔ سید سلیمان ندوی کے بقول ان کا قلم حد سے زیادہ چلبلا اور البیلا تھا۔ شوخ سے شوخ بات کو معصومانہ انداز میں کہنے کا ہنر انھیں خوب آتا تھا۔ محفوظ علی بدایونی کی ظرافت کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ عام طور پر وہ اپنے شگفتہ اندازِ بیان سے پڑھنے والے کے دل میں ظرافت کی ہلکی ہلکی لہریں پیدا کرتے ہیں۔ ایک مزیدار بات یہ ہے کہ عموماً وہ پردے کے پیچھے ہی چھپے رہے۔ انھوں نے نقیب، ملا بودھا، مرئی شمع بے نور اور تجاہلِ عامیانہ جیسے فرضی ناموں سے لکھا۔

www.urduchannel.in

خواجہ حسن نظامی کی ظریفانہ تحریریں مزیدار ضرور ہیں مگر آورد کا انداز ناگوار ہوتا ہے۔ لفظوں کے الٹ پھیر سے وہ بہت کام لیتے ہیں۔ رعایت لفظی ان کی تحریروں میں بہت ملتی ہے۔ وہ عموماً ایسے نکتے نکالتے ہیں جن کا عام ذہن میں آنا مشکل ہے۔ مثلاً اپنی ذہانت سے کیکر کو گلاب سے افضل ثابت کر دینا۔ جھینگر اور مچھر کی خوبیاں گنانا۔ قاضی عبدالغفار کی نگارشات میں بھی طنز و مزاح کی اچھی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ان کا مزاج فلسفیانہ ہے۔ اس لیے ان کی ظرافت میں بھی تفکر کا رنگ جھلکتا ہے ان کے یہاں خالص ظرافت کم اور طنز زیادہ ہے اور اس طنز کی خصوصیت ہے شدت، تہ داری اور رمزیہ انداز۔

سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری اور پریم چند کے یہاں بھی طنز و ظرافت کے عناصر نظر آتے ہیں۔ پریم چند کا سماجی شعور بہت پختہ ہے اس لیے سماجی ناہمواریاں ان کے شدید طنز کا نشانہ بنتی ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ تلخی بڑھ جاتی ہے مگر طنز زیادہ کارگر اور زیادہ پر اثر ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اردو طنز و ظرافت کے اس دور کا آغاز ہوتا ہے جسے ہم سنہری دور یا دور عروج کہہ سکتے ہیں۔

دورِ عروج

طنز و ظرافت کا یہ دور جسے دور عروج اور دور زریں کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے بہت زرخیز دور ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ظرافت نے مختلف سمتوں میں سفر کیا، ہر رنگ اور ہر سطح کی ظرافت وجود میں آئی۔ ایک طرف وہ ظرافت نگار ہیں جن کی تحریروں میں فلسفیانہ گہرائی ہے تو دوسری طرف ہلکی پھلکی ظرافت کے نمونے بھی موجود ہیں۔ طنز کی بھی کمی نہیں شدید اور ہلکا دونوں طرح کا طنز بھی موجود ہے۔ خالص ظرافت کے اعلیٰ نمونے بھی کثرت سے نظر آتے ہیں۔ مصنفین کی تعداد بھی کم نہیں۔ سب کا ذکر تو یہاں ممکن نہیں۔ صرف معروف مصنفین کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

۱۸۸۴ء - ۱۹۴۷ء

ہمارے مزاح نگاروں میں مرزا فرحت اللہ بیگ کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ وہ خاکہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں اور ان خاکوں کو ہر دل عزیز بنانے میں مرزا کی فطری ظرافت کو بہت دخل ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔ تنقید، افسانہ، سوانح، سیرت، معاشرت و اخلاق کی طرف انھوں نے توجہ کی لیکن ان کی اصل شہرت کا مدار ظرافت نگاری پر ہے۔

وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے اجداد شاہ عالم ثانی کے عہد میں ترکستان سے آئے اور دہلی کو اپنا وطن بنایا۔ یہیں ۱۸۸۴ء میں مرزا کی ولادت ہوئی۔ تعلیم بھی یہیں ہوئی۔ کالج کی تعلیم کے دوران مولوی نذیر احمد سے ملاقات ہوئی۔ ان سے نہ صرف عربی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی بلکہ ان کی شخصیت کا گہرا اثر بھی قبول کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حیدر آباد گئے۔ وہاں مختلف عہدوں پر فائز ہوئے ۱۹۴۷ء میں وفات پائی۔

ان کی تصنیف "دلی کا آخری یادگار مشاعرہ" مرقع نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ مولوی نذیر احمد کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا اور بہت برسوں دیکھا تھا۔ "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" میں ان کی ہو بہو تصویر اتاری ہے۔ اس خاکے نے ان کو لازوال شہرت عطا کی۔ یہ خاکہ مولوی وحید الدین سلیم کو ایسا پسند آیا کہ انھوں نے اپنا خاکہ لکھنے کی فرمائش کی۔ ان کی وفات کے بعد مرزا نے اس فرمائش کو پورا کر دیا اور اس خاکے کو "ایک وصیت کی تعمیل میں" نام دیا۔ انھوں نے بڑی تعداد میں مضامین لکھے جو مضامینِ فرحت کے نام سے سات جلدوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ شاعری بھی کی لیکن یہ ان کا اصل میدان نہیں۔ دہلی کی ٹکسالی زبان پر انھیں بڑی قدرت حاصل ہے اور شوخی ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔

Lightshot

www.urduchannel.in

ان کے مضامین پڑھ کر ہم ہنستے نہیں، قہقہہ نہیں لگاتے بس ایک ذہنی فرحت حاصل کرتے ہیں۔ جب وہ کسی موضوع یا کسی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس جزئیات نگاری سے قاری کو بہت لطف و لذت حاصل ہوتی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ اصلاً مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں طنز کم ہے اور جہاں ہے وہاں شدت نہیں بس ہلکی ہلکی چوٹیں ہیں جن سے کہیں بھی زہرناکی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ فلسفیانہ گہرائی اور سنجیدگی سے حتی الامکان اپنا دامن بچاتے ہیں۔ ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ قاری زیادہ سے زیادہ محظوظ ہے۔

عظیم بیگ چغتائی

۱۸۹۵ء - ۱۹۴۱ء

اردو کے مقبول مزاح نگاروں میں ایک نام عظیم بیگ چغتائی کا ہے۔ ان کے ہلکے پھلکے مزاح کی بنیاد لڑکپن کی شرارتوں پر ہے جن سے ہر انسان کو کبھی نہ کبھی سابقہ پڑا ہے۔ اس لیے عام لوگوں نے ان کی ظرافت کو بہت پسند کیا۔

عظیم بیگ چغتائی کی ولادت جودھپور میں ہوئی۔ وہیں ابتدائی تعلیم پائی۔ ولادت سے وفات تک علالت کا سلسلہ جاری رہا۔ بے حد کمزور تھے اس لیے بہن بھائیوں کو ڈانٹ پڑتی رہتی تھی کہ انھیں نہ چھیڑیں، انھیں نہ ستائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو چوٹ لگ جائے۔ اس برتاؤ کا ان کی شخصیت پر برا اثر پڑا اور طبیعت میں ایک نفسیاتی گرہ پڑ گئی۔ عصمت چغتائی ان کی بہن تھیں۔ انھوں نے "دوزخی" کے عنوان سے ان کا خاکہ لکھا اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا بہت دلچسپ انداز میں ذکر کیا۔ مسلسل بیماری کے سبب شور شرابہ اور اچھل کود ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کمی کو انھوں نے اپنی مزاحیہ تحریروں سے پورا کیا۔ لڑکپن کی جن شرارتوں کی تصویریں عظیم بیگ چغتائی اپنی تحریروں میں کھینچتے ہیں وہ اس کمزوری کا فطری ردعمل ہے۔ طویل عرصے تک وہ دق کے مرض میں مبتلا رہے۔ آخر ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔

بلند پایہ ظرافت نگاروں میں ان کا شمار نہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ان کے پاس نہ اہم موضوعات ہیں نہ اہم خیالات۔ بس کھیل کود اور شوخی و شرارت کے قصے ہیں غور و فکر اور سنجیدہ موضوعات کا ان کے یہاں فقدان ہے۔ اسی لیے ساری ظرافت پلاٹ اور مضحکہ خیز واقعات سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کے کردار ہمہ وقت ہنسانے والی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ عظیم بیگ کی تخلیقات میں جو دنیا نظر آتی ہے اس میں ہر آن ہنگامہ برپا رہتا ہے۔

ان کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ وہ قلم روک کر نہیں لکھتے۔ مضمون ہو یا ناول و افسانہ۔ یہ بے حد ضروری ہے کہ مصنف پہلے اس کی منصوبہ بندی کرے پھر قلم اٹھائے۔ اس کے بعد اپنی تحریر پر برابر نظر ثانی کرتا رہے۔ اسے سنوارتا اور نکھارتا رہے۔ خونِ جگر صرف کیے بغیر اعلیٰ درجے کا ادب وجود میں نہیں آسکتا۔ بسیار نویسی کے علاوہ زبان کی طرف بے توجہی بھی ان کا عیب ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ عظیم بیگ چغتائی معاشرے کی خرابیوں سے بیزار تھے اور اصلاح کی خواہش رکھتے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ظریفانہ اور طنزیہ مضامین بھی لکھے۔ اس کے علاوہ "قرآن اور پردہ" جیسی سنجیدہ کتاب بھی لکھی۔

شریر بیوی، کوتاہ اور خانم کو اردو ادب میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔

ملا رموزی

۱۸۹۶ء - ۱۹۵۲ء

ملا رموزی گلابی اردو کے موجد کی حیثیت سے ہمارے ادب میں پہچانے جاتے ہیں۔ خود ان کے الفاظ میں گلابی اردو کا مطلب یہ ہے کہ جملے میں الفاظ کی ترتیب کو بدل دیا جائے مثلاً یہ کہ پہلے فعل پھر فاعل اور مفعول۔ اس طرح عربی سے اردو ترجمے کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ بے شک یہ لطف دیتا ہے لیکن ذرا دیر بعد قاری اکتا جاتا ہے۔

ملا رموزی کا اصل نام صدیق ارشاد تھا۔ بھوپال میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ یہ ان کا آبائی وطن نہیں تھا۔ ان کے والد اور چچا کابل (افغانستان) سے آکر بھوپال میں

www.urduchannel.in

رہنے لگے۔ دونوں عالم تھے اس لیے اعلیٰ ملازمتوں سے نوازے گئے۔ صدیق الرشاد اردو، فارسی، عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کانپور کے مدرسۂ الٰہیات میں داخل ہوئے۔ اسی زمانے میں مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ ان کے مضامین معیاری رسالوں میں شایع ہوئے۔ اب انھوں نے اپنا قلمی نام ملا رموزی رکھ لیا اور دنیائے ادب میں اسی نام سے مشہور ہوئے۔

ملک میں تحریکِ آزادی نے زور پکڑا تو ملا رموزی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سیاسی مسائل پر اچھی نظر تھی۔ حکومت کے خلاف مزاحیہ انداز میں مضامین لکھنے لگے جنھیں پسند کیا گیا۔ کئی رسالوں نے انھیں مدیر بنانے پر فخر کیا۔ اس کے بعد وحیدیہ ٹیکنیکل اسکول میں مدرس ہوگئے۔ ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔

ملا رموزی نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر و مقرر بھی تھے۔ انتظامی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، علم و ادب کے فروغ کے لیے انھوں نے کئی انجمنیں قایم کیں لیکن ان کی اصل شہرت گلابی اردو پر ہے جس کے وہ خود ہی موجد ہیں۔ آن کی یہ نرالے رنگ کی کتاب "گلابی اردو" کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شایع ہوئی۔ اسے قبولِ عام نصیب ہوا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ قبولِ عام دیرپا نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے سیاست کو اپنا مستقل موضوع قرار دیا اور سادہ و سلیس زبان اختیار کی۔ طنز و مزاح سے طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔ اس لیے سادگی میں بھی ظرافت کا ہلکا ہلکا رنگ برقرار رہا۔ اسے پسند کیا گیا۔

خود تحریر فرماتے ہیں کہ میرے مضامین کی کوئی اہمیت ہے تو صرف اس لیے کہ "میں حقیقت کا دامن نہیں چھوڑتا" حکومت کے مظالم، سماجی ناانصافی اور معاشرتی معائب انھیں صاف نظر آتے ہیں اور وہ طنزیہ انداز میں ان پر انگلی اٹھائے بغیر نہیں رہتے۔ حالات انھیں مجبور کرتے ہیں کہ جو کچھ لکھیں ظرافت کی آڑ میں لکھیں۔ نتیجہ یہ کہ دلچسپی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

پطرس بخاری

۱۸۹۸ء - ۱۹۵۸ء

پطرس نے انسانوی انداز میں ظرافت آمیز مضمون لکھے اور وہ بھی صرف چند۔ مگر ان مضامین میں کچھ ایسی جاذبیت و دلکشی ہے

حاصل ہوگئی۔ آج اردو کے ظریفانہ ادب کا سخت سے سخت انتخاب کیا جائے تو پطرس کی تخلیقات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ان کا اصل نام سید احمد شاہ بخاری اور والد کا نام سید اسد اللہ شاہ بخاری تھا۔ ۱۸۹۸ء میں پیشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں مکمل ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور آکر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ تعلیم سے بہت دلچسپی تھی اور مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ وقت کا زیادہ تر حصہ کتب بینی میں صرف ہوتا تھا انگریزی ادب سے خاص شغف تھا۔ اساتذہ اور طلبا ان سے یکساں طور پر محبت کرتے تھے۔ کالج کی تعلیم سے فارغ ہوکر مزید تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ کئی برس یہاں قیام رہا۔ یہاں بھی اپنی ذہانت اور ذوقِ مطالعہ کے سبب ہم جماعتوں میں سربلند رہے۔

انگلستان سے واپسی کے بعد معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ انگریزی ادب ان کا مضمون تھا۔ چنانچہ تھوڑے دن ٹریننگ کالج سے وابستہ رہنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو میں اسسٹنٹ کنٹرولر کی جگہ تقرر ہوگیا۔ چار سال میں ترقی کرکے کنٹرولر جنرل ہوگئے۔ ان کی رہنمائی کے سبب آل انڈیا ریڈیو کے وقار میں بہت اضافہ ہوا لیکن درس و تدریس سے ان کی طبیعت کو بے حد مناسبت تھی۔ چنانچہ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں پرنسپل کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تحریکِ آزادی شباب پر تھی اور ملک آزادی سے ہمکنار ہونے والا تھا۔ جلد ہی دنیا کے نقشے پر پاکستان وجود میں آگیا۔ انھوں نے سرکاری ملازمت قبول کرلی۔ بخاری نے متعدد عالمی کانفرنسوں میں حکومتِ پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔ اب دنیا ان کی صلاحیتوں کا لوہا مان چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں اقوامِ متحدہ (یو۔این۔او) کے شعبۂ اطلاعات کے جنرل سکریٹری منتخب کیے گئے۔ وہ پہلے ایشیائی تھے جو اتنے اونچے بین الاقوامی عہدے پر فائز ہوئے۔ اسی زمانے میں انھیں کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے پروفیسر کا منصب پیش کیا گیا لیکن

Lightshot

www.urduchannel.in

۱۹۵۸ء میں نیویارک میں ان کی وفات ہو گئی۔

پطرس پہلے انگریزی ادب کے ہونہار طالب علم اور پھر اسی مضمون کے لائق استاد رہے۔ اپنے مضمون کا مطالعہ انھوں نے بہت توجہ کے ساتھ کیا۔ مضمون نگاری کی طرف متوجہ ہوئے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ انگریزی کے مزاحیہ ادب سے فائدہ نہ اٹھاتے۔ ان کے مضامین خالص مزاح کا نمونہ ہیں جن میں طنز کی نہایت خفیف اور خوشگوار لہریں جا بجا نظر آتی ہیں۔ یہ انگریزی مزاح کا ہی فیضان ہے۔ اپنے ہر مضمون میں وہ مقامی رنگ اور مقامی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ مغرب سے متاثر ہیں۔

خالص مزاحیہ ادب پطرس سے پہلے بھی اردو میں موجود تھا مگر اس کی بنیاد پھکڑپن اور سستے چٹکلوں پر تھی۔ پطرس کے مضامین اس عیب سے پاک ہیں۔ بقول وزیر آغا انھوں نے مغربی ادب سے فیض اٹھاتے ہوئے خالص مزاح کے حربوں یعنی واقعہ، کردار، موازنہ اور اسٹائل کی ظرافت کو بے اختیار اپنا لیا اور ان کی مدد سے اپنی مزاح نگاری کو پروان چڑھانے کی قابلِ قدر کوشش کی لیکن انھوں نے سب سے بڑا کمال واقعے سے مزاح پیدا کرنے میں حاصل کیا ہے۔ گویا واقعہ نگاری ان کے مزاح کی بنیادی خصوصیت ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ وہ طنز کا نشانہ اپنی ذات کو ہی بناتے ہیں۔

مرید پور کا پیر، میں ایک میاں ہوں، مرحوم کی یاد میں (بائیسکل) سویرے جو کل آنکھ میری کھلی ان کے مشہور مضامین ہیں۔

رشید احمد صدیقی

۱۸۹۶ء - ۱۹۷۷ء

رشید احمد صدیقی کو پروفیسر احتشام حسین نے اس دور کا سب سے بڑا مزاح نگار تسلیم کیا ہے۔ لیکن یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ وہ بہت بڑے طنز نگار بھی ہیں۔ طنز نگاری ایک نازک فن ہے۔ ذرا قلم کو لغزش ہوئی اور کسی نہ کسی کی دل آزاری کا پہلو نکل آیا مگر ان کا قلم ہمیشہ اس الزام سے بری رہا۔

رشید احمد صدیقی جون پور کے رہنے والے تھے۔ وہیں شروع کی تعلیم ہوئی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے واقعات "آشفتہ بیانی میری" میں بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور وہیں شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ علی گڑھ کو ہی انھوں نے اپنا وطن بنا لیا۔ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور آخر تک یہیں رہ کر تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول رہے۔ ۱۹۷۷ء میں وفات پائی۔

خاکے، انشائیے، علمی مضامین انھوں نے سبھی کچھ لکھا مگر ان کی شہرت کا مدار طنز و ظرافت پر ہے۔ ان کے قلم سے جو تحریر بھی نکلی اس میں مزاح موجِ تہ نشیں کی طرح کار فرما ہے۔ علمی مضامین میں اس کی گنجائش کم ہے مگر ان کی شگفتہ مزاجی یہاں بھی اپنا کرشمہ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

رشید احمد صدیقی کا مطالعہ وسیع ہے۔ یہ علمیت ان کے ظریفانہ مضامین سے بھی نمایاں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تحریروں میں تفکر کی کارفرمائی ہے۔ ہنسانے کے پہلو بہ پہلو وہ قاری کو غور و فکر پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ یہ ان کی عظمت کی دلیل ہے لیکن اس خصوصیت نے ان کی ظرافت کو ایک معنی میں نقصان بھی پہنچایا۔ ان کی اکثر تحریریں بوجھل ہو گئیں۔ عام قاری اکثر ان سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اور وہ خواص کے مصنف ہو کے رہ جاتے ہیں۔ ظرافت کا کام لطف اندوزی ہے۔ تحریر ہلکی پھلکی ہو تو لطف دوگنا ہو جاتا ہے۔

لفظی بازی گری اور فلسفیانہ عمل دیگر خصوصیات ہیں جو ان کی تحریروں کو مشکل بنا دیتی ہیں۔ بے شک اس طرح ایک خاص طنزیہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں ظرافت کی اس قسم کو جنم دیتی ہیں جسے "وِٹ" یعنی بذلہ سنجی کہا جاتا ہے اور جن سے صرف مخصوص ذہن ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ رشید صاحب کی طنز لطیف اور نفیس تو ہوتی ہے لیکن استعاروں علامتوں اور مبہم اشاروں کے سبب عام قارئین تک اس کی رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔

علی گڑھ کے وہ بہت دلدادہ ہیں اور ان کی تصانیف میں علی گڑھ جا بجا جلوہ گر ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ جو علی گڑھ سے واقف ہیں وہ ان کی تحریروں کے دیوانے ہیں مگر جنھوں نے علی گڑھ نہیں

www.urduchannel.in

دیکھا وہ ان سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ علی گڑھ کی اس فراوانی کے باوجود رشید احمد صدیقی کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ دیہاتی ڈاکٹر ہو، ارہر کا کھیت ہو، وکیل ہو یا چارپائی جو شے ان کے مشاہدے میں آتی ہے اس پر بے تکان لکھ ڈالتے ہیں۔ زبان پر انھیں بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ لفظ ان کے ہاتھ میں آکر موم کی طرح نرم ہو جاتے ہیں اور وہ جس شکل میں انھیں ڈھالنا چاہتے ہیں بہ آسانی ڈھال لیتے ہیں۔

خنداں، مضامین رشید، ذاکر صاحب، آشفتہ بیانی میری، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسانِ رفتہ، شیخ نیازی، جدید غزل، طنزیات و مضحکات ان سے یادگار ہیں۔

شوکت تھانوی

۱۹۰۵ء - ۱۹۶۳ء

اتنی مقبولیت کم شہ پاروں کو نصیب ہوتی ہے جتنی شوکت تھانوی کے مزاحیہ افسانے "سودیشی ریل" کو نصیب ہوئی۔ مضحکہ خیز واقعات سنا کر ہنسانے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔ ان کے یہاں گہرائی نہ سہی مگر عام لوگوں کو ہنسانے کا مواد خوب مل جاتا ہے۔ تقریباً چالیس کتابیں لکھ کر انھوں نے اردو کے مزاحیہ ادب میں بہت اضافہ کیا۔

ان کا اصلی نام محمد عمر والد کا نام صدیق احمد، سال ولادت ۱۹۰۵ء اور جائے پیدائش بندرابن تھا کیوں کہ ان کے والد یہاں کوتوال کی حیثیت سے متعین تھے حالانکہ ان کا وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر تھا۔ محمد عمر نے جب شوکت قلمی نام رکھا تو وطن کی مناسبت سے اس پر تھانوی اضافہ کیا۔ اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور بمشکل ہوئی کیونکہ وہ پڑھنے کے شوقین نہیں تھے۔

والد ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو ان کے ساتھ بھوپال اور پھر لکھنؤ چلے آئے۔ والدین نے مستقل رہائش کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کر لیا تھا۔ یہیں شوکت تھانوی کی تصنیفی صلاحیت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اپنی تخلیقات کے لیے انھوں نے ظرافت کا انتخاب کیا۔ ۱۹۳۲ء کے آس پاس مزاحیہ افسانہ "سودیشی ریل" لکھا تو شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ اسی شہرت کے سبب آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ وفات سے پہلے پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں بھی ریڈیو کی ملازمت مل گئی تھی۔ لاہور میں ۱۹۶۳ء میں وفات پائی۔

لفظوں کے الٹ پھیر سے، لطیفوں سے، رعایت لفظی سے، محاورے سے، املا کی ناہمواری سے اور زیادہ تر مضحکہ خیز واقعات سے شوکت تھانوی نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کے طنز و مزاح میں گہرائی نہیں بلکہ سطحیت ہے۔ اعلیٰ درجے کی تخلیق بہت غور و فکر اور بے حد محنت کے بعد ہی وجود میں آسکتی ہے۔ شوکت تھانوی کے یہاں ان دونوں چیزوں کی کمی ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ اتنا زیادہ لکھنے والا نہ سوچنے کے لیے وقت نکال سکتا ہے اور نہ اپنی تحریروں پر نظر ثانی کر سکتا ہے۔ ظرافت کو فن کارانہ انداز میں پیش نہ کیا جائے تو وہ ہنسانے کی ایک ناکام کوشش بن کے رہ جاتی ہے۔ شوکت ہنسانے میں تو کامیاب ہیں مگر قاری کو غور و فکر پر مجبور نہیں کرتے حالانکہ ان کی تحریروں میں مقصدیت موجود ہے۔ وہ سماجی خامیوں اور انسانی سیرت کی ناہمواریوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان پر ہنستے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ سودیشی ریل، تعزیت اور لکھنؤ کانگریس سیشن ان کی کامیاب کوششیں ہیں۔

موجِ تبسم، بحرِ تبسم، سیلابِ تبسم، طوفانِ تبسم، سوتیا چاہ، کارٹون، بدولت، جوڑ توڑ، سسرال ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ انھوں نے شاعری بھی کی، ریڈیو ڈرامے بھی لکھے اور "تیشۂ عمل" کے نام سے خاکوں کا ایک مجموعہ بھی پیش کیا۔

کنھیا لال کپور

۱۹۱۰ء - ۱۹۸۰ء

کنھیا لال کپور ہمارے عہد کے بہت کامیاب طنز نگار و ظرافت نگار ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر بسیار نویسی کے باوجود ان کی تحریریں معیار سے گرنے نہیں پائیں۔ سبب یہ کہ وہ پختہ فنی شعور کے مالک ہیں اور جانتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کا ادب کس طرح وجود میں آتا ہے۔

کنھیا لال کپور ۱۹۱۰ء میں لائل پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ لائل پور پنجاب کا

www.urduchannel.in

ایک ضلع ہے اور اب پاکستان میں شامل ہے۔ یہیں ایک پرائمری اسکول میں تعلیم پائی۔ موگا سے انٹرمیجیٹ اور لاہور سے بی۔ اے۔ ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف کالجوں میں لکچرار اور پرنسپل رہے۔ تقسیم ملک کے بعد فیروزپور اور موگا میں ملازمت کی۔ وہیں قیام رہا۔ ۱۹۸۰ء میں انتقال ہوا۔

ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انگریزی ادب کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب سے انھیں شناسائی حاصل ہے۔ اس لیے وہ ان تمام تدابیر سے بخوبی واقف ہیں جن سے طنز و ظرافت میں حسن اور اثر پیدا ہوتا ہے۔ ان کا دائرہ کار بھی بہت وسیع ہے۔ فطرت انسانی سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں اس لیے انسان کی عالمگیر کمزوریوں کی بڑی کامیابی کے ساتھ گرفت کرتے ہیں اور ان کی تخلیقات زمان و مکاں یعنی وقت اور مقام سے اوپر اٹھ جاتی ہیں۔ ہر زمانے اور ہر مقام کے لوگ ان کی تصانیف سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ فلسفۂ قناعت کا مرید شیخ چلی اور انکم ٹیکس والے اسی طرح کے مضامین ہیں۔

کنھیالال کپور کے طنز میں تیزی بھی ہے اور نفاست بھی۔ ان کا طنز تیز دھار والے نشتر کی طرح بڑی صفائی سے عمل جراحی کرتا ہے۔ ان کا موضوع ادب ہے۔ اس لیے وہ عموماً ادبی موضوعات کو طنز و ظرافت کا نشانہ بناتے ہیں۔ مثلاً "چینی شاعری" اور "غالب جدید شعرا کی مجلس میں" معیاری مضامین ہیں۔ ان کے مضامین میں ادبیت نظر آتی ہے۔ زبان پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ اس لیے صاف ستھری زبان لکھتے ہیں۔ تصنیف کے ابتدائی دور میں ان کی زبان زیادہ نکھری ہوئی نہیں تھی مگر رفتہ رفتہ زبان پر گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ آخری دور کے مضامین میں سادگی اور روانی زیادہ ہے۔ ان کا ذوق مزاح بہت شستہ ہے۔ وہ محض لفظی الٹ پھیر یا ناہموار زبان و بیان سے ظرافت پیدا نہیں کرتے بلکہ خیال و کردار کے وسیلے سے اسے ابھارتے ہیں۔

سنگ و خشت، شیشہ و تیشہ، چنگ و رباب، نوک نشتر، بال و پر، نرم گرم اور

کامریڈ شیخ چلی ان کے مشہور مجموعے ہیں۔

کرشن چندر

کرشن چندر بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور افسانہ نگاری کے ذیل میں ہی تفصیل سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن طنز و ظرافت ان کے ۱۹۱۳ء - ۱۹۷۷ء افسانوں کا نمایاں وصف ہے۔ انھوں نے علیحدہ سے بھی طنزیہ اور ظریفانہ مضامین لکھے۔ اس لیے اختصار کے ساتھ یہاں بھی ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ان کا بچپن کشمیر میں گزرا اور کشمیر کا حسن ان کی طبیعت میں رچ بس گیا۔ چنانچہ جب افسانہ و ظرافت کی طرف توجہ کی تو وہاں بھی وادیٔ کشمیر کے سے شاداب پھول کھل اٹھے۔ کرشن چندر معلمی، وکالت اور ریڈیو سے متعلق رہے مگر دنیائے ادب میں افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی چمکے۔

بڑا فن کار زیادہ حساس اور نازک مزاج ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اس لیے سماج میں جتنے عیب اور جتنی خرابیاں ہیں وہ اس سے چھپ نہیں سکتیں۔ کرشن چندر ایک بڑے فن کار ہیں اور سیرت انسانی کے نبض شناش۔ داغدار سماج انھیں بہت تکلیف پہنچاتا ہے اور وہ اس پر طنز کرتے ہیں مگر کرشن چندر کی فطری خوش مزاجی اور نرمی طنز کو ناگوار نہیں ہونے دیتی۔ اس میں ظرافت پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا سماجی شعور زیادہ پختہ و بیدار ہے۔

انھوں نے کچھ خالصتاً طنزیہ مضامین بھی لکھے جو "ہوائی قلعے" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اس مجموعے کے بہت دلچسپ مضامین ہیں: مانگے کی کتابیں، سو راج سے پچاس سال بعد، ہوائی قلعے۔

دیگر مصنفین

شفیق الرحمان اردو کے معروف فکشن نگار ہیں۔ سنجیدہ سماجی مسائل سے وہ کم ہی سروکار رکھتے ہیں۔ ہلکی پھلکی باتیں، جوان لڑکے لڑکیوں کی نادانیاں اور حماقتیں ان کا خاص موضوع ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے زبان بھی ہلکی پھلکی

www.urduchannel.in

ہے۔ لطیفے اور چٹکلے ان کی تحریروں کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خوشگوار ظرافت کی لہری دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ پرواز، شگوفے، حماقتیں، لہریں، کرنیں ان کی مشہور و مقبول کتابیں ہیں۔

ظرافت نگاروں میں فرقت کاکوروی (ولادت: ۱۹۱۴ء وفات ۱۹۷۳ء) کا بھی شمار ہے۔ مداوا، ناروا، صید و ہدف، کف گل فروش ان کی کتابیں ہیں۔ ان کے طنز کا خاص نشانہ ترقی پسند شعرا ہیں جنھوں نے ترقی پسندی کی دھن میں فن کاری کو نظر انداز کر دیا۔

غلام عباس، بلونت سنگھ، قدرت اللہ شہاب، عصمت چغتائی، منٹو، اشفاق احمد اور انتظار حسین کی تحریروں میں بھی طنز و ظرافت کے چھینٹے مل جاتے ہیں۔ آغا بابر کے مضامین پان، حلقۂ اربابِ ذوق مولانا صلاح الدین احمد کے مضامین "آج کی اردو کتاب" "یوں عمر گزرتی ہے" قابلِ ذکر ہیں۔

پیروڈی

پیروڈی کو ہماری زبان میں "تحریف" کہتے ہیں۔ تحریف کے نمونے ہمارے قدیم ادب میں بھی ملتے ہیں لیکن اسے فروغ مغربی ادب کا ذوق عام ہونے کے بعد ہوا۔ تحریف کے معنی الٹنے کے ہیں۔ تحریف سے مراد یہ ہے کہ کسی تصنیف کی اس طرح نقل کی جائے کہ اس کی شکل تو برقرار رہے لیکن الفاظ میں اس طرح ردوبدل ہو کہ اس سے ہنسی آئے۔ پیروڈی نظم میں بھی ہو سکتی ہے اور نثر میں بھی۔

اردو نثر میں پیروڈی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں مثلاً چراغ حسن حسرت کی "پنجاب کا جغرافیہ"۔ پطرس کی "اردو کی آخری کتاب" شفیق الرحمان کی "تزکِ نادری" احمد جمال پاشا

کی "کپور کا فن" "کنھیالال کپور کی "غالب جدید شعرا کی محفل میں" اور "حالی ترقی پسند ادیبوں کی محفل میں"۔ ان کے علاوہ بھی ہمارے ادب میں پیروڈی کے بہت سے کامیاب نمونے موجود ہیں۔

دورِ حاضر

پچھلے کچھ برسوں میں اعلیٰ درجے کا طنزیاتی اور مضحکاتی ادب وجود میں آیا ہے۔ اس میدان میں بعض ایسے مصنفوں نے قدم رکھا ہے جن کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ گہرا اور ادبی ذوق بے حد نکھرا ہوا ہے ان مصنفوں کی تعداد کم نہیں۔ یہاں ان میں سے صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ابنِ انشا

ابنِ انشا شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ ان کی نثر ایک خوش مزاج، شگفتہ بیان صاحبِ قلم کی تحریر ہے جسے طنز و ظرافت کی آمیزش نے اور بھی پرکشش بنا دیا ہے۔ ان کی نثری تصانیف کا بڑا حصہ سفرناموں پر مشتمل ہے وہ دیس دیس نگر نگر گھومے تھے۔ انھوں نے جہاں، جو کچھ دیکھا وہیں اسے قلم بند کر کے چھپنے کے لیے بھیج دیا۔ موت کا احساس ان پر اس طرح غالب تھا کہ کبھی قلم روک کر نہیں لکھا اور جو لکھا اسے چھپوانے کی جلدی رہی۔ اپنی تخلیق کو فنی تکمیل کے ساتھ پیش کرنے کی مہلت انھیں کم ہی ملی۔ ان کی تحریروں میں لطافت و نفاست کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ مشتاق یوسفی نے لکھا ہے "بچھو کا کاٹا مارتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشا جی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا ہے۔ بے شک ان کے طنز میں بہت کاٹ ہے لیکن ظرافت کی آمیزش اسے خوشگوار بنا دیتی ہے۔ انھوں نے بہت لکھا مگر "اردو کی آخری کتاب" اور "خمارِ گندم" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

www.urduchannel.in

کرنل محمد خاں

محمد خاں نے اپنی پہلی تصنیف "بجنگ آمد" کے ساتھ ظرافت کے میدان میں قدم رکھا جسے ہر طرف سراہا گیا۔ اس میں عالمی جنگ کے واقعات ایک عینی شاہد کی زبان سے بڑے دلفریب انداز میں پیش ہوئے ہیں۔ دوسری کتاب "بسلامت روی" ہے۔ یہ سفر نامہ ہے اور تیسری بزم آرائیاں۔ محمد خاں زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے مضحکہ خیز واقعات کو ایسے لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور بس۔ بعض جگہ تو صرف ہلکا سا ذہنی انبساط اور دھیما سا سرور ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح ان کی مزاح نگاری کا سلسلہ غالب کی ظرافت سے مل جاتا ہے۔

مشتاق یوسفی

مشتاق یوسفی ہمارے عہد کے سب سے بڑے ظرافت نگار ہیں۔ طنز کی ان کے یہاں کمی نہیں لیکن طنز کو وہ ایسی ہنرمندی سے ظرافت کا لباس پہناتے ہیں کہ اس کا سراغ پانا محال ہو جاتا ہے تا آں کہ وہ تیز نشتر کی طرح کسی عیب یا کسی سراپا عیب کے سینے میں اتر نہ جائے۔ طنز کی اسی صفت کو یوسفی نے میٹھی مار کا نام دیا ہے یہ وار بقول ان کے شوخ آنکھ، پرکار عورت اور دلیر کے وار کی طرح کبھی خالی نہیں جاتا۔ ان کا مزاح شائستہ ہونے کے باوجود شوخ رنگ ہے۔ مگر ان کی تحریریں صرف ہنساتی ہی نہیں فکر کو بیدار بھی کرتی ہیں۔ ان کا مضمون فلسفہ رہا ہے۔ اسی لیے ان کے سوچنے کا انداز فلسفیانہ ہے۔ ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں پر خونِ جگر صرف کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاتھوں معجزۂ فن وجود میں آتا ہے۔

احمد جمال پاشا

احمد جمال پاشا نے طنز و ظرافت میں نام پیدا کیا مگر ان کی ایک پیروڈی ایسی ہے جو انھیں زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ یہ ہے "کیور کا فن" اس میں قاضی عبدالودود، احتشام حسین، آل احمد سرور اور عبادت بریلوی کے اسلوب نگارش کی مزاحیہ انداز میں نقل کی گئی ہے۔

مشفق خواجہ اپنے انوکھے اور منفرد انداز میں کتابوں پر تبصرے کرتے ہیں اور چپکے سے ایسی چوٹ کر جاتے ہیں کہ صاحب کتاب سمجھ جائے تو برسوں اس چوٹ کو سہلاتا رہے۔

انجم مان پوری، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت، فرقت کاکوروی، قمر الہدیٰ فریدی، مشتاق قمر، محمد خالد اختر، مسعود مفتی، نظیر صدیقی، عطاالحق قاسمی، غلام جیلانی اصغر، انور سدید باقر علیم کا ذکر کیے بغیر طنز و مزاح کا یہ باب کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتا۔

---

www.urduchannel.in

۱۲

تحقیق

فن پارہ وجود میں آنے کے بعد تنقید اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے یعنی یہ بتاتی ہے کہ اس میں اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے لیکن ان دونوں کے درمیان ایک اور شے بھی ہے جو اس پر غور کرتی ہے کہ فن کار کون ہے، کہاں کا رہنے والا ہے، کب پیدا ہوا، اور یہ فن پارہ کب، کن حالات میں اور کن اسباب کی بنا پر وجود میں آیا۔ اس کا نام تحقیق ہے اور تحقیق کے معنی ہیں سچ کی تلاش۔ فن پارے کے بارے میں چھان بین بھی ضروری ہے۔ مثلاً وہ فن پارہ شعر ہے تو یہ کھوج کرنی پڑتی ہے کہ اس کی پہلی شکل کیا تھی۔ بعد کو شاعر نے اس میں کیا رد و بدل کی۔ محقق یعنی تحقیق کرنے والا ان سب باتوں کا پتہ لگاتا ہے اور ہر طرح اطمینان کر لینے کے بعد اسے ترتیب دے کر پیش کر دیتا ہے۔ یہ کام تدوین کہلاتا ہے۔ متن یعنی ٹیکسٹ کی ٹھیک سے تحقیق نہ ہو تو تنقید کی بنیاد کھوکھلی رہتی ہے۔ مثلاً میر تقی میر پر ایک تنقیدی مضمون ایسا لکھا گیا جس میں ایک شعر کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ بعد کو تحقیق نے ثابت کر دیا کہ یہ شعر میر کا ہے ہی نہیں۔ یہ معلوم ہوتے ہی وہ مضمون بیکار ہو گیا اور تنقید کی عمارت مسمار ہو گئی۔

اردو میں تدوین کا کام اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب پہلے دور کے شاعر شاہ حاتم نے اپنے دیوان کا انتخاب کیا اور دیوان زادہ اس کا نام رکھا۔ سرسید نے آئین اکبری اور تزک جہانگیری کو ترتیب دیا۔ مولوی عبدالحق نے شعرائے اردو کے کئی تذکرے اور شاعروں کے دیوان مرتب کیے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ مجموعۂ نغز ترتیب دیا۔ قاضی عبدالودود نے بھی ترتیب کے کئی اہم کام انجام دیے۔ امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام نے دیوانِ غالب کی ترتیب کا اہم فرض انجام دیا۔ مسعود حسین رضوی نے مراثی کا متن متعین کیا۔ ان کے علاوہ مختار الدین احمد، نذیر احمد، نور الحسن ہاشمی، مسعود حسین خاں، تنویر احمد علوی، مشفق خواجہ، خلیق انجم، رشید حسن خاں، محمود الٰہی، مسیح الزماں، جمیل جالبی، فرمان فتح پوری، خلیل الرحمٰن داؤدی، حنیف نقوی نے تحقیق کے سلسلے میں اہم کام کیے ہیں۔

عبدالحق

۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو کی ترقی کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جو اردو کی فکر سے خالی ہو۔ یہ ان کی خدمات کا اعتراف ہی ہے کہ وہ ہر جگہ بابائے اردو کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

عبدالحق ۱۸۷۰ء میں ہاپڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لیے محمڈن کالج علی گڑھ بھیجے گئے۔ یہاں ان کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ سرسید تک رسائی تھی۔ اس ذاتِ گرامی سے براہ راست فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ یہیں مولانا حالیؔ اور محسن الملک سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ سرسید کے صاحب زادے جسٹس محمود سے بھی ملاقات تھی۔ سرسید نے تصنیف و تالیف کا کچھ کام عبدالحق کے سپرد بھی کیا اس طرح لکھنے پڑھنے کی پہلی تربیت اسی مردِ بزرگ کے ہاتھوں ہوئی۔

تعلیم سے فارغ ہو کر عبدالحق تلاشِ معاش میں حیدرآباد چلے گئے اور ایک اسکول میں مدرس کی ملازمت قبول کرلی۔ آخر ترقی پا کر مدارس کے انسپکٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ سے مختصر عرصے منسلک رہے۔ آخر اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ اب انھیں انجمن ترقی اردو کو مستحکم کرنے کا موقع ملا۔ اسی کے ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر میں عثمانیہ یونیورسٹی

www.urduchannel.in

کے شعبۂ اردو کے صدر ہوگئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد دہلی آگئے اور اردو نیز انجمن ترقی اردو کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ ملک تقسیم ہوگیا تو کراچی چلے گئے اور وہاں بھی اردو کے فروغ کی کوشش میں لگے رہے۔ آخر وہیں ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔ بابائے اردو کی خدمات کے اعتراف میں الہ آباد یونیورسٹی نے ۱۹۳۷ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کا یہ کارنامہ قابلِ قدر ہے کہ قدیم اردو ادب کا جو سرمایہ مخطوطات کی شکل میں صندوقچوں اور الماریوں میں بند تھا اور جس کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ تھا مولوی صاحب نے اسے ترتیب دے کر شائع کیا اور برباد ہونے سے بچالیا۔ ان کتابوں پر مولوی صاحب نے مقدمے لکھے، ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مصنفین کے حالاتِ زندگی دریافت کرکے ہم تک پہنچائے، ان تصانیف کے عہد کی خصوصیات واضح کیں اور اردو تنقید کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کردی۔

چھان بین کے بعد بہت سی غلط فہمیوں کو رد کیا مثلاً اس خیال کی تردید کی کہ میر امن کی باغ و بہار فارسی کے قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ انھوں نے دلیلوں سے ثابت کردیا کہ اس کا ماخذ لوطرزِ مرصع ہے۔ مولوی صاحب کی زبان سادہ و سلیس ہوتی ہے جیسی تحقیق کے لیے ضروری ہے۔

مقدماتِ عبدالحق، خطبات عبدالحق، تنقیدات عبدالحق ان سے یادگار ہیں۔ فرہنگ، لغت اور اصطلاحات پر بھی انھوں نے کام کیا۔ "چند ہم عصر" ان کی مقبول کتاب ہے جس میں مختلف شخصیتوں پر مضمون شامل ہیں۔

محمود شیرانی

حافظ محمود شیرانی کا اردو کے نامور محققوں میں شمار ہے۔ تحقیق سے ان کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔ ان کا وطن پنجاب ہے۔ وہیں ۱۸۸۰ء - ۱۹۴۶ء ان کا قیام رہا۔

شیرانی نے اردو کی پیدائش کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اردو پنجاب سے نکلی۔ انھوں نے شاہوں سے ثابت کیا ہے کہ اردو اور پنجابی میں بہت یکسانیت ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کا مولد پنجاب ہے۔ ان کی کتاب کا نام ہے "پنجاب میں اردو"۔ ان کی ایک اہم تحقیقی کتاب پر تھوی راج راسو پر ہے۔ قدرت اللہ قاسم کے تذکرے "مجموعۂ نغز" کا واحد نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں محفوظ تھا۔ انھوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ اسے ترتیب دے کر شائع کیا۔

شیرانی عربی، فارسی کے بڑے عالم تھے اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ چنانچہ وہ محققین و مصنفین کی غلطیوں پر بہت آسانی سے انگلی رکھ دیتے تھے۔ مولانا آزاد، علامہ شبلی وغیرہ کی غلطیوں کی انھوں نے خاص طور پر گرفت کی ہے۔

قاضی عبدالودود

۱۸۹۶ء - ۱۹۸۴ء

قاضی عبدالودود نے تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ انھوں نے وقت کا بیشتر حصہ مطالعے میں صرف کیا۔ حافظہ بھی قوی پایا تھا۔ اس لیے جو کچھ پڑھا وہ یاد رہ گیا۔ اسی لیے کوئی غلطی ان کی نظر سے بچ کر نہیں جاسکتی۔ علمائے ادب کی غلطیوں کی گرفت انھوں نے بہت کی ہے۔

پٹنہ (بہار) ان کا وطن ہے۔ سال ولادت ۱۸۹۶ء ہے۔ وہ ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی عبدالوحید بریلوی مسلک پر کاربند تھے اور حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب کے خاص ارادت مندوں میں شامل تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور وہاں سے بیرسٹری کی سند لے کر لوٹے۔ مغرب کے اثر اور قانون کے مطالعے نے انھیں تحقیقی ذہن عطا کیا۔ انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کیا بلکہ تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوگئے۔ مطالعے کا شوق تو پہلے سے تھا۔ اب ان کا سارا وقت اسی میں صرف ہونے لگا۔ مستقل قیام پٹنہ میں رہا۔ لیکن علمی مشاغل کے سلسلے میں بار بار مختلف مقامات کا سفر کرنا پڑتا تھا۔

وہ مزاج کے بڑے کھرے تھے۔ خوش خلق ہونے کے باوجود سچ بات بڑی بے باکی سے

www.urduchannel.in

اور بالکل دو ٹوک انداز میں کہتے تھے۔ اس معاملے میں قریبی دوستوں کے ساتھ بھی رو رعایت سے کام نہیں لیتے تھے اور تحقیق کے لیے یہ ضروری ہے۔ ان کی تنقید بالکل غیر جانب دارانہ ہوتی تھی۔ انھوں نے جو کچھ کہا بڑی قطعیت کے ساتھ کہا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔

ان کے اہم تحقیقی کارناموں میں غالب بحیثیت محقق، یادداشت ہائے قاضی عبدالودود، جہانِ غالب، آوارہ گرد اشعار اور تعینِ زمانہ شامل ہیں۔ دیوانِ جوشش، دیوانِ رضا، قطعاتِ رضا اور تذکرۂ ابن طوفان مرتب کرکے انھوں نے تدوین کا معیاری نمونہ پیش کیا ہے۔ قاطعِ برہان اشتر و سوزن، عیارستان اور تذکرۂ مسرت افزا کی ترتیب ان کے دیگر اہم کام ہیں۔ انھوں نے پٹنہ سے ایک تحقیقی رسالہ "معاصر" بھی نکالا جس نے تحقیق کی قابلِ قدر خدمت انجام دی "تحقیق" کا صرف ایک شمارہ نکل سکا۔

انھوں نے جو زبان استعمال کی اس میں دلکشی بے شک نہیں ہے لیکن وہ خالص تحقیقی زبان ہے جسے ریاضی کی زبان بھی کہا جا سکتا ہے۔ کفایتِ لفظی سے وہ بہت کام لیتے ہیں اور کہیں بھی الفاظ کا غیر ضروری استعمال نہیں کرتے۔ اردو تحقیق ان کے احسان سے گراں بار ہے۔

ان کا انتقال ۱۹۸۴ء میں ہوا۔

امتیاز علی خاں عرشی

۱۹۰۴ء - ۱۹۸۱ء

اردو تحقیق کے چند اہم ستونوں میں سے ایک امتیاز علی خاں عرشی ہیں۔ ان کی ساری زندگی تحقیق اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی۔ اس میدان میں ان کے کارنامے نہایت اہم ہیں۔ انھیں ماہر غالبیات کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔

امتیاز علی خاں عرشی کا وطن رام پور ہے۔ سال ولادت ہے ۱۹۰۴ء۔ زندگی بھر وہ رام پور کے ایک عظیم علمی ادارے رضا لائبریری سے وابستہ رہے جہاں نادر و نایاب کتابوں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے۔ اس ذخیرے سے وہ خود فیض یاب ہوئے اور علمی دنیا کو اس سے فیض پہنچایا۔ ان کا اصل میدان عربی ادب تھا لیکن اردو میں بھی ان کے کارنامے نہایت

اہم ہیں۔ غالب ان کا خاص موضوع ہے۔ انھوں نے دیوانِ غالب کو زمانی اعتبار سے مرتب کیا جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا کون سا کلام کس زمانے کا ہے۔ اس سے غالب کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ تدوین کا اچھا نمونہ ہے۔ یہ دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) کے نام سے مشہور ہے۔ احمد علی خاں یکتا کا تذکرہ (دستور الفصاحت) بھی انھوں نے بہت محنت سے ترتیب دیا۔ بہت سے تحقیقی مضامین بھی ان سے یادگار ہیں۔

عرشی صاحب کی وفات ۱۹۸۱ء میں ہوئی۔

مالک رام

۱۹۰۷ء - ۱۹۹۳ء

اردو تحقیق میں مالک رام کا پایہ بھی بلند ہے۔ غالب ان کی توجہ کا مرکز رہے اسی لیے ماہرینِ غالبیات میں ان کا شمار ہے۔

مالک رام ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ صحافت سے ان کا خاص تعلق رہا۔ ابتدا میں یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ کچھ عرصے تک آریہ گزٹ، نیرنگ خیال اور بھارت ماتا سے وابستہ رہے۔ بعد کو امورِ خارجہ کی وزارت میں ملازم ہوئے اور ملک سے باہر بھی قیام رہا۔

ان کا پہلا مضمون ذوق اور غالب کے عنوان سے ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ غالب کی سوانح (ذکرِ غالب) غالب کے تلامذۂ (تلامذۂ غالب) ان کے قابلِ ذکر کارنامے ہیں۔ انھوں نے دیوانِ غالب، کربلِ کتھا اور غبارِ خاطر کو بہت سلیقے کے ساتھ ترتیب دیا۔

نورالحسن ہاشمی

ولادت ۱۹۳۰ء

نورالحسن ہاشمی نے تدوین کے کاموں کی طرف توجہ کی اور اردو تحقیق میں خاص طور پر دلچسپی لی۔ ان کا تحقیقی مقالہ "دلی کا دبستانِ شاعری" اردو تحقیق کی بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اس مقالے پر انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ نوطرزِ مرصع، کلیاتِ ولی، کلیاتِ جعفر علی حسرت مرتب کرکے انھوں نے اردو ادب کی اہم خدمت انجام دی۔

www.urduchannel.in

مسعود حسین خاں

ولادت ۱۹۱۹ء

ممتاز محقق، نامور نقاد اور مشہور ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

ان کا سال ولادت ۱۹۱۹ء اور وطن قائم گنج (اتر پردیش) ہے۔ دہلی اور ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ مزید تعلیم کے لیے یورپ گئے اور پیرس یونیورسٹی سے لسانیات میں ڈی۔ لٹ کی ڈگری لی۔ ہندوستان واپس آکر آل انڈیا ریڈیو سے بہ سلسلۂ ملازمت منسلک ہوگئے۔ لیکن یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ نہیں تھا۔ اصل دلچسپی درس و تدریس سے تھی۔ ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد عثمانیہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔ پھر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں پہلے پروفیسر و صدر کا عہدہ سنبھالا۔ یونی ورسٹی آف کیلی فورنیا (امریکہ) اور کشمیر یونی ورسٹی سری نگر میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ ۱۹۷۳ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ اردو علی گڑھ کے اعزازی وائس چانسلر اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے پروفیسر ایمریٹس کے عہدوں پر فائز ہوئے اور علی گڑھ میں رہایش اختیار کر کے تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگئے۔ علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ساہتیہ اکاڈمی اوارڈ (۱۹۸۴ء) سے نوازا گیا۔

مسعود حسین خاں شاعر بھی ہیں۔ "روپ بنگال" اور "دو نیم" ان کے شعری مجموعے ہیں۔ "روپ بنگال" کا ہندی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ بکٹ کہانی، عاشور نامہ اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ سائنٹی فک اصولوں پر ترتیب دے کر انھوں نے قابل قدر خدمت انجام دی۔

حیدرآباد میں قیام کے دوران "قدیم اردو" کے نام سے انھوں نے ایک تحقیقی جریدہ جاری کیا تھا جس کا مقصد تھا جدید اصول کی بنیاد پر قدیم متون کی اشاعت۔ ایک لغت کی تیاری کا کام بھی انھوں نے انجام دیا۔ "اقبال کی نظری و عملی شعریات" میں اقبال کی شاعری کا لسانیات کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ شعر و زبان، اردو زبان و ادب اور اردو کا المیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ لسانیات کو یہاں بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ "مقدمہ تاریخ زبان اردو" ان کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس میں اردو کے آغاز و ارتقا کے مسئلے پر مدلل بحث کی گئی ہے۔

نذیر احمد

ولادت۔ ۱۹۱۵ء

اُن کا اصل مضمون فارسی ہے لیکن اردو زبان و ادب کے سلسلے میں بھی انھوں نے کئی اہم کام کیے۔

ان کا وطن گونڈہ ہے اور سال ولادت ۱۹۱۵ء۔ تعلیم لکھنؤ اور پھر ایران میں ہوئی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد فارسی درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسر و صدر شعبۂ فارسی کے عہدے سے ریٹائر ہوگئے۔

تحقیق ان کا مزاج ہے اور ان کے وقت کا بیشتر حصہ اسی کام میں صرف ہوا۔ فارسی ادب اور اردو ادب دونوں طرف ان کی توجہ رہی۔ ان کے تحقیقی مضامین کی تعداد خاصی ہے۔ اردو ادب کے دکنی سرمایے سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی "نورس" کو انھوں نے بہت سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔

مختار الدین احمد

ولادت ۱۹۲۴ء

مختار الدین احمد کا اصل مضمون عربی ہے۔ عربی ادب میں ان کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کو عرب ممالک میں بھی سراہا گیا۔ لیکن اردو تحقیق بھی ان کی توجہ سے محروم نہیں رہی۔ انھوں نے تدوین کے بھی کئی اچھے نمونے پیش کیے۔

ان کا وطن پٹنہ اور سال ولادت ۱۹۲۴ء ہے۔ سلسلۂ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ ان کے اجداد میں ایک بزرگ سید ابراہیم تھے جو سلطان فیروز شاہ تغلق کے

www.urduchannel.in

زمانے میں غزنی سے ہندوستان پہنچے اور فوجی قابلیت کی بنا پر شاہی فوج میں ملازم ہوگئے۔ ایک جنگ میں شہادت پائی۔ ان کی اولاد میں ایک عالم مولانا ظفر الدین تھے۔ مختار الدین احمد انہی کے فرزند ہیں۔ پہلے نام غلام معین الدین رکھا گیا لیکن بعد کو بدل کے مختار الدین احمد کر دیا گیا۔ اسی نام سے شہرت پائی۔ بچپن ننہال میں موضع استھانواں میں گزرا بعد کو والدہ کے ساتھ پٹنہ آگئے۔ عربی تعلیم بہت امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ والدہ کی خواہش تھی کہ مزید تعلیم کے لیے جامعہ ازہر بھیجا جائے مگر یہ دوسری عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ اسی لیے یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔ پٹنہ کے بعد تعلیم کے لیے علی گڑھ آئے۔ یہاں بھی عربی تعلیم میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ یہیں سے ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ تعلیم کے سلسلے میں آکسفورڈ میں بھی قیام رہا۔ آخر علی گڑھ کے شعبۂ عربی سے وابستہ ہوگئے۔ یہیں سے بحیثیت پروفیسر و صدر شعبۂ ریٹائر ہوئے اور اسی شہر کو وطن بنا لیا۔ تصنیف و تالیف سے شروع سے شغف تھا۔ ملازمت سے فارغ ہوئے تو ہمہ تن علمی کاموں میں مصروف ہوگئے۔

خطوطِ اکبر، احوالِ غالب و نقدِ غالب، تذکرۂ آزردہ، دیوانِ حضور، مکاتیبِ اکبر، تذکرۂ گلشنِ ہند از حیدری، تذکرہ شعرائے فرخ آباد از ولی اللہ فرخ آبادی ترتیب و تدوین کے عمدہ نمونے ہیں۔ عبدالحق پر ان کی کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کئی اور اہم کام زیرِ تکمیل ہیں۔

مشفق خواجہ مشفق خواجہ اپنی محنت اور ذہانت کے لیے معروف ہیں۔ تحقیق سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ انھوں نے مخطوطات کی وضاحتی فہرست (جائزہ مخطوطات اردو) مرتب کی احمد دین کی کتاب "اقبال" اور "خوش معرکۂ زیبا" کی ترتیب کا اہم کام انجام دیا۔

خلیق انجم ان کی تحقیقی و تنقیدی کتاب "متنی تنقید" (۱۹۶۷ء) اہم ہے۔ سودا پر ان کا تحقیقی کام بھی قابلِ قدر ہے۔ خطوطِ غالب کی ترتیب میں بھی انھوں نے عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے۔

رشید حسن خاں کے مضامین (ادبی تحقیق: مسائل و تجزیہ) گلزارِ نسیم، باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کی ترتیب بھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ "تنویر احمد علوی" نے "اصولِ تحقیق" پیش کر کے ایک کمی کو پورا کیا۔ انھوں نے شاہ نصیر اور ذوق کے کلیات بھی ترتیب دیے۔ قصیدے پر محمود الٰہی مرثیے پر مسیح الزماں، مثنوی پر گیان چند اور گوپی چند نارنگ کا کام قابلِ توجہ ہے۔ فرمان فتح پوری اور حنیف نقوی نے شعرائے اردو کے تذکروں پر کام کیا۔

---

www.urduchannel.in

(۱۳)

تنقید

جب کوئی فن پارہ وجود میں آتا ہے تو وہ قارئین تک پہنچتا ہے۔ یہ لوگ اسے سراہتے ہیں یا ناپسند کرتے ہیں۔ جو علم اس پسند اور ناپسند کے اسباب تلاش کرتا ہے وہ تنقید کہلاتا ہے۔ آئیے اب غور کریں کہ تنقید کیا ہے، اس کی ضرورت کیوں ہے اور اردو میں اس کا آغاز کب اور کن حالات میں ہوا۔

تنقید کیا ہے؟

تنقید نام ہے کسی فن پارے کو پرکھنے اور اس کے محاسن و معائب کا پتا لگانے کا نیز یہ طے کرنے کا کہ ادب میں اس کا کیا مقام ہے۔ تنقید فن پارے اور اس کے پڑھنے والے کے درمیان رابطے کا کام کرتی ہے۔ اس لیے وہ کبھی فن پارے کی صراحت کرتی ہے تو کبھی تشریح و ترجمانی اور کبھی تجزیے سے کام لیتی ہے۔

تنقید نگار کسی ادب پارے کے معائب و محاسن یعنی خرابیوں اور خوبیوں کا پتا لگانے اور اس کی گہرائی میں پہنچنے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ وہ ہر زاویے سے اسے دیکھتا، ہر ممکن طریقے سے کھنگالتا اور اس کی تمام باریکیوں سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ پھر اس سے آگے بڑھ کے وہ فن کار کو سمجھنے اور اس کے ذہن میں اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس کے عہد اور ماحول کا جائزہ لیتا ہے۔ جتنے علوم مددگار ہو سکتے ہیں وہ ان سب کی مدد سے چھان بین اور تلاش و جستجو کا عمل اس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک اسے اپنے مقصد

میں کامیابی حاصل نہ ہو جائے یعنی وہ فن پارے کی تہ تک نہ پہنچ جائے۔ گویا وہ ادب اور فن کی دنیا کا کوہ پیما ہے۔

تنقید کیوں ضروری ہے؟

بہت لوگ ہیں جنھوں نے تنقید کو ادب کے لیے مضر بتایا ہے اور کہا ہے کہ تنقید ادب کی ترقی کو روکتی ہے۔ یہ خواہ مخواہ فن کار اور قاری کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ فلابیر تنقید کو ادب کے جسم کا کوڑھ کہتے ہیں، ٹینی سن اسے ادب کے گیسوؤں کی جوں بتاتے ہیں، ہے خف تنقید کو اس مکھی سے تشبیہ دیتے ہیں جو گھوڑے کو ہل چلانے سے روکتی ہے۔ لیکن یہ ساری باتیں اس تنقید کے بارے میں ہیں جو فن کاروں پر کیچڑ اچھالتی ہے اور ان سے ذاتی پرخاش کا بدلہ لیتی ہے۔ ورنہ اصلیت یہ ہے کہ تنقید ادب کے لیے بے حد ضروری ہے۔ رچرڈ سن کا ارشاد بجا ہے کہ تنقید ادب کے ساتھ وہ سلوک کرتی ہے جو ڈاکٹر جسم کے ساتھ کرتا ہے یعنی اس کی صحت کا خیال رکھتا ہے۔ تنقید ادب کی اس طرح خدمت کرتی ہے جس طرح مالی چمن کی کرتا ہے۔ وہ چمن سے گھاس پھوس کو نکال پھینکتا ہے، پھولوں اور پودوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

تنقید کے اصول

ادب کو پرکھنے کے کچھ اصول مقرر کیے گئے۔ تنقید نگار اپنی اپنی نظر سے ادب کو پرکھتے ہیں اور اس کے لیے الگ الگ کسوٹیاں منتخب کرتے ہیں۔ لیکن دو اصول ایسے ہیں جنھیں کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پہلے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادب پارے میں جو کچھ کہا گیا ہے یا جو تجربہ پیش کیا گیا ہے اس کی کیا اہمیت ہے۔ دوسرے یہ کہ پیشکش کا انداز کیا ہے۔ یہ اصول تو وہ ہیں جنھیں ہر کوئی تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ ان کے علاوہ مختلف گروہوں نے اپنے اپنے اصول مقرر کر رکھے ہیں مثلاً ایک گروہ یہ دیکھتا ہے کہ فن پارے میں حسن کاری کس درجے کی ہے تو دوسرا گروہ یہ دیکھتا ہے کہ فن کار کی شخصیت اس کے فن میں کس حد تک جھلکتی ہے۔ مطلب یہ کہ مختلف دبستانوں کے مختلف اصول ہیں۔ آئیے اب یہ دیکھیں کہ دبستان سے کیا مراد ہے۔

www.urduchannel.in

تنقید کے دبستان

ادب کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا اور مختلف کسوٹیوں پر پرکھا جا سکتا ہے۔ جو تنقید نگار ہم خیال ہوں اور ادب کو پرکھنے کے لیے جن کے اصول یکساں ہوں، ان کی جماعت کو ہم تنقید کا دبستان کہیں گے۔ تنقید کی دنیا میں اس طرح کے مختلف دبستان موجود ہیں۔ مثلاً نقادوں کا ایک گروہ یہ دیکھتا ہے کہ کسی ادب پارے سے ہمارے دل پر کیا تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ اسے تاثراتی تنقید کا دبستان کہا جاتا ہے۔ تنقید کا جمالیاتی دبستان اس سے سروکار رکھتا ہے کہ کسی فن پارے میں حسن کاری کس حد تک موجود ہے۔ مارکسی اور ترقی پسند تنقید کارل مارکس سے متاثر ہے اور ادب سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کی حمایت کرے۔ نفسیاتی تنقید کے علمبردار فن پارے کا نفسیات کی روشنی میں تجزیہ کرکے فن کار کے ذہن تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلوبیاتی تنقید ادب پارے کا تجزیہ کرکے اس کی خصوصیات واضح کرتی ہے۔ ساختیاتی تنقید ایک نئی چیز ہے۔ ادب کی شعریات کی تلاش جس کا مقصد ہے۔ سائنٹفک تنقید ادب کو ایسے معیاروں سے پرکھنے کی کوشش ہے جس میں سائنس کی سی صحت، قطعیت اور غیر جانب داری ہو۔ یہ ہیں تنقید کے مختلف دبستان اور ان کا طریق کار۔

آغاز و ارتقا

جب کوئی فن پارہ وجود میں آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تنقید بھی وجود میں آجاتی ہے کیوں کہ تنقیدی شعور کے بغیر نہ کوئی شعر جنم لے سکتا ہے نہ کوئی نثر پارہ۔ یہ تنقیدی شعور ہی ہے جس کی روشنی میں فن کار اپنی تخلیق کو سنوار کر، نکھار کر تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اس کے بعد وہ منزل آتی ہے جب فن کی خوبیوں یا خرابیوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ دنیا کے تقریباً ہر ادب میں یہ تنقیدی اشارے پہلے پہل شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اور شاعروں نے ہی سب سے پہلے اس پر غور کیا کہ شاعری کیا ہے اور اس میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ مثلاً شیکسپیئر کی رائے ہے کہ اپنے گرد پھیلی ہوئی دنیا کو بہ غور دیکھنے، تخیل سے اس دنیا میں رنگ بھرنے اور اس کی ہو بہو تصویر اتار دینے کا نام ہی شاعری ہے۔ حسان بن ثابت کی نظر میں اچھا

شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہہ اٹھیں کہ سچ کہا ہے۔ عرفی کی رائے میں وہ شعر اچھا کہلانے کا مستحق ہے جو حسن صورت کے ساتھ حسن معنی بھی رکھتا ہو۔ ہمارے قدیم شعرا میں سب سے پہلے وجہی نے اپنے کلام میں شاعری کی بابت اپنی رائے ظاہر کی کہ لفظ و معنی دونوں کی اہمیت یکساں ہے اور شاعری کے لیے ربطِ کلام اور سلاست ضروری ہے۔ غواصی نے الفاظ کے انتخاب و ترتیب اور تشبیہوں کی اہمیت پر زور دیا۔ ولی، سراج، آبرو، میر، غالب، اقبال بھی نے شاعری کے فن پر اظہار خیال کیا۔

اس کے علاوہ تنقید کے ابتدائی نقوش شعرائے اردو کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجایش نہ تھی اس لیے صرف سرسری اشارے ہی کیے جا سکے۔ اس کے بعد زمانہ ایک نئی کروٹ لیتا ہے۔ مغل حکومت کی جگہ ملک میں انگریزی راج قائم ہو جاتا ہے۔ انگریزوں کے ذریعے مغربی ادب کے اثرات ہندوستان پہنچتے ہیں۔ سرسید پہلے شخص ہیں جو ادب کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں مگر انھیں مہلت نہ مل سکی کہ اپنے تنقیدی نظریات کو کتابی شکل میں پیش کرتے۔ ان کے خیالات ان کے مضمونوں اور تقریروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ حالی نے انھیں سمیٹا، مزید غور کیا اور مقدمہ شعر و شاعری کی شکل میں پیش کر دیا۔ اس طرح تنقید کی پہلی باضابطہ کتاب وجود میں آئی۔ محمد حسین آزاد اور علامہ شبلی نے بھی اردو تنقید کی نشو و نما میں مدد کی۔ مولوی عبدالحق اور محمود شیرانی نے تنقید کو تحقیق کا رخ دیا۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ سید احتشام حسین، محمد حسن، قمر رئیس اور سید محمد عقیل نے اردو تنقید کی اس نئی جہت کو بہت فروغ دیا۔ مجنوں گورکھپوری اور کلیم الدین احمد نے اس تحریک کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ آل احمد سرور نے اعتدال و توازن کا راستہ دکھایا اور ادب کی ادبیت پر زور دیا۔ محمد حسن عسکری نے اس سلسلے میں شدت پسندی سے کام لیا۔ خورشید الاسلام نے تاثراتی تنقید کو فروغ دیا۔ گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی عالمی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو تنقید

www.urduchannel.in

کونئی جہتوں سے روشناس کیا۔

اہم تنقید نگار

سرسید اور حالی سے لے کر عہد حاضر تک اردو تنقید کا کارواں مختلف منزلوں سے گزرا۔ جن اہل قلم نے فن تنقید کو بام عروج پر پہنچایا ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان سب کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ ذیل میں ہم صرف ان شخصیتوں کا مختصر تعارف کرائیں گے جن کا ذکر ناگزیر ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی

۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء

اردو تنقید حالی کے احسان سے گراں بار ہے۔ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے اپنے مجموعۂ نظم کا پیش لفظ "مقدمہ شعر و شاعری" لکھ کر اردو میں باضابطہ تنقید کی بنیاد ڈالی۔ آل احمد سرور نے اسے اردو شاعری کا پہلا منشور (مینی فیسٹو) کہا ہے۔ مقدمے میں حالی نے یہ رائے دی ہے کہ شاعری محض لطف اندوزی اور وقت گزاری کا ذریعہ نہیں۔ اس سے زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا کام لیا جانا چاہیے اور دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ شاعری سے یہ کام لیا جاتا رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب اور اخلاق سے شاعری کا گہرا تعلق ہے نیز یہ کہ شاعری اور سوسائٹی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

وہ شاعری کے لیے تین شرطوں کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ یہ ہیں تخیل، مطالعۂ کائنات اور تفحص الفاظ۔ تخیل نام ہے خیال کی پرواز کا۔ مطلب یہ کہ شاعر ایک چیز کو دیکھتا ہے اور اس کا خیال دس چیزوں کی طرف جاتا ہے مثلاً پھول میں کبھی اسے خدا کا جلوہ نظر آتا ہے تو کبھی مجازی محبوب کا، پھول کی بکھری ہوئی پتیاں اسے عاشق کے چاک گریباں کی یاد دلاتی ہیں۔ کبھی پھول کی مختصر زندگی اسے انسانی زندگی کی بے ثباتی یاد دلاتی ہے۔ حالی کہتے ہیں تخیل کی قوت خداداد ہے

شاعر اسے اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور یہ شاعری کے لیے اتنی ضروری ہے کہ اس کے بغیر شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ مشورہ دیتے ہیں کہ شاعر کا تخیل حد سے زیادہ بلند نہ ہونا چاہیے ورنہ قارئین اسے سمجھ نہ پائیں گے۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے اس کا مواد اسی کائنات سے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اس کائنات کو غور سے دیکھے اور انسانی زندگی کی کتاب یعنی علم نفسیات سے اچھی طرح واقف ہو اور تیسری بات یہ کہ شعر کہنے کے دوران تفحص الفاظ یعنی الفاظ کی تلاش پر خاص توجہ دے۔

سادگی، جوش اور اصلیت کو وہ شعر کی خوبی ٹھہراتے ہیں۔ شعر کے لیے وزن اور قافیے کو وہ ضروری تو نہیں سمجھتے لیکن ان دونوں چیزوں کو شاعری کا زیور بتاتے ہیں۔ وہ شاعر کو مشورہ دیتے ہیں کہ خلاف فطرت مضامین سے دور رہے۔

مقدمہ شعر و شاعری میں انھوں نے اردو کی چار اہم اصناف غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ غزل سے انھیں شکایت ہے کہ وہ عشق و عاشقی کے دائرے میں قید ہے۔ قصیدہ انھیں خوشامد اور جھوٹ سے لبریز نظر آتا ہے۔ مرثیہ انھیں پسند ہے کہ اخلاق کی تعلیم کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ مثنوی کا تسلسل اس کا موقع دیتا ہے کہ یہاں کسی موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال کیا جا سکے۔ مقدمہ شعر و شاعری کے علاوہ حالی کے تنقیدی نظریات حیات سعدی اور یادگار غالب میں بھی موجود ہیں۔ حالی اور سرسید کے خیالات یکساں ہیں۔ حالی سے پہلے سرسید یہی خیالات مختلف تقریروں اور مضمونوں میں پیش کر چکے تھے مگر عدیم الفرصت تھے اس لیے اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہ لکھ سکے۔

علامہ شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء

حالی کے بعد شبلی ہمارے دوسرے بڑے نقاد ہیں جن کے تنقیدی نظریات نے اپنے زمانے کے ادبی ذوق کو متاثر کیا۔ ان کی تصانیف کا مطالعہ کیجیے تو قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے خیالات حالی کے خیالات کی ضد ہیں۔ حالی شعر و ادب سے افادیت کا مطالبہ کرتے

www.urduchannel.in

ہیں یعنی ان کے نزدیک شاعری کا اصل کام اخلاق کو درست کرنا اور زندگی کو سنوارنا ہے۔ شبلی کے نزدیک شاعری کا مقصد ہے پڑھنے یا سننے والے کو مسرت عطا کرنا۔ ان کی نظر اس حقیقت پر رہتی کہ فن کار نے فن کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کیا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ شبلی جمالیاتی نقاد ہیں۔ ان کے نزدیک شعر و ادب میں حسن کاری ہی اصل شے ہے۔ اس طرح حالی شعر میں معنی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور شبلی لفظ کو۔ حالی سادگی کے قائل ہیں تو شبلی مینا کاری کے۔ تشبیہ و استعارہ کو شاعری کے لیے وہ بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔

علامہ شبلی کے نزدیک شاعری دو چیزوں کا نام ہے۔ یہ ہیں محاکات اور تخیل۔ محاکات سے شبلی کی مراد کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح بیان کرنا ہے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ گویا محاکات وہ شے ہے جسے ہم تصویر کشی یا آج کی زبان میں شعری پیکر کہتے ہیں۔ محاکات سے زیادہ وہ تخیل کو ضروری سمجھتے ہیں اور اسے قوت اختراع یعنی نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کی قوت بتاتے ہیں۔

فرماتے ہیں خدا نے انسان کو دو قوتیں دی ہیں۔ ایک ادراک اور دوسری احساس۔ ادراک کا کام سوچنا، غور کرنا اور مسائل کو حل کرنا ہے۔ احساس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی اثر انگیز واقعہ پیش آتا ہے تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے، خوشی میں سرور ہوتا ہے، حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے۔ یہی قوت جس کو احساس کہتے ہیں، شاعری کا دوسرا نام ہے۔ یہ احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

شبلی کے تنقیدی افکار کو سمجھنے کے لیے سب سے اہم تصنیف "شعر العجم" ہے اور خاص طور پر اس کا چوتھا حصہ جس میں تنقیدی نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ موازنۂ انیس و دبیر اور مقالات شبلی کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

محمد حسین آزاد

۱۸۳۰ء - ۱۹۱۰ء

اردو کے اولین تنقید نگاروں میں ایک نام مولوی محمد حسین آزاد کا بھی ہے۔ مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے بہت

پہلے یعنی ۱۸۶۷ء میں آزاد نے شاعری پر ایک لکچر دیا اور کئی اہم مسئلوں پر روشنی ڈالی۔ اس لیے اردو تنقید میں اولیت کا تاج انھی کے سر پر رکھا جانا چاہیے۔ اس لکچر (نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات) کے ساتھ مقدمۂ نظم آزاد، آبِ حیات اور سخندان فارس کا مطالعہ کیجیے تو آزاد کے تنقیدی نظریات واضح ہو جاتے ہیں۔ پہلے ان کے خیالات پر مشرقیت کا غلبہ تھا لیکن ملک کے بدلے ہوئے حالات نے انھیں متاثر کیا۔ آخر انھیں اردو شاعری کی تنگ دامانی کا گلہ ہوا اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں اور ہمارے پہلو میں دھرے ہیں مگر ہمیں خبر نہیں۔ ہاں ان صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے"۔

آزاد کو یہ بھی گلہ ہے کہ ہمارا شاعر اپنے ملک کی چیزوں کو نظر انداز کر کے ملک سے باہر نظر دوڑاتا ہے۔ اسے دجلہ و فرات تو نظر آتے ہیں گنگا جمنا دکھائی نہیں دیتیں۔ نسرین، نسترن، شمشاد و صنوبر اسے بھاتے ہیں مگر گلاب، چمپا، چمیلی کی اسے خبر نہیں۔ آزاد نے بھاشا کی طرف متوجہ ہونے کا مشورہ دیا۔

غزل سے وہ اس حد تک بیزار ہو گئے کہ انھوں نے لاہور میں مجلس مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جس میں نظم کے لیے موضوع دیا جاتا تھا۔

آزاد کی تنقید کا ایک بہت بڑا عیب جانب داری ہے۔ تنقید میں وہ انصاف سے کام نہیں لیتے اپنی ذاتی پسند و ناپسند کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ نہ ہوتا تو وہ بہت بڑے نقاد ہوتے۔ آزاد کا ایک کمال یہ ہے کہ ان کی تحریر میں غضب کی دلکشی ہوتی ہے۔ اسی انداز بیان کو دیکھ کر علامہ شبلی نے فرمایا تھا کہ "وہ گپ بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے"۔

مولوی عبدالحق

۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء

بقول کلیم الدین احمد مولوی عبدالحق نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمت کی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان و ادب کی خدمت ان کی زندگی کا نصب العین رہا ہے۔ وہ محقق بھی

www.urduchannel.in

ہیں اور نقاد بھی۔ محنت اور غور و فکر ان کی عادت ہے۔ اپنے موضوعات پر کامل عبور رکھتے ہیں اور جب تک بات کی تہ کو نہیں پہنچ جاتے رائے زنی نہیں کرتے۔ ذوق صحیح رکھتے ہیں۔ اچھے برے اور کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتے ہیں۔"

مولوی عبدالحق کی طبیعت کا رجحان تحقیق کی طرف تھا۔ یہی رجحان ان کی تنقیدوں میں بھی جھلکتا ہے۔ انھوں نے ہماری قدیم کتابوں کو تلاش کیا اور انھیں ترتیب دے کر شائع کیا۔ شاعروں اور ادیبوں کے حالات کا سراغ لگایا۔ لیکن ان کے تنقیدی مضامین بھی کچھ کم اہم نہیں۔ ان کی تنقید کی خاص خوبی ہے اعتدال، توازن اور مکمل غیر جانب داری۔ سنجیدگی اور متانت مولوی صاحب کے مزاج کا حصہ ہیں۔

سرسیّد سے وہ بہت متاثر ہیں۔ ان کی علمی لیاقت اور ادبی ذوق کی تربیت سرسید کے زیر سایہ ہوئی۔ سرسیّد نے متعدد بار ان سے تصنیف و تالیف کے کام لیے۔ اس لیے مولوی صاحب سرسیّد کی نثر سے متاثر بھی ہوئے اور اس کے مداح بھی رہے لیکن ذہنی طور پر وہ ان سے زیادہ حالی کے نزدیک نظر آتے ہیں۔ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں مغربی تنقید سے شناسائی ضرور رکھتے ہیں مگر دُور دُور سے۔ بنیادی طور پر دونوں کا ذہن مشرقی ہے۔ اور دونوں ہی علماے مشرق کے خیالات و افکار سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اسلوب نگارش کے اعتبار سے بھی مولوی صاحب سرسیّد سے زیادہ حالی کی نثر سے متاثر ہیں بلکہ ان کی نثر حالی کی نثر سے زیادہ دلکش ہے۔ دونوں غور و فکر کے عادی ہیں، سوچ سمجھ کر قلم اٹھاتے ہیں اور واضح طور پر اپنی رائے دیتے ہیں۔

برج نراین چکبست

۱۸۸۲ء - ۱۹۲۶ء

اصلاً تو وہ نظم گو شاعر ہیں لیکن ان کے تنقیدی مضامین کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے بیشتر تنقیدی مقالے ان شخصیتوں پر لکھے جن سے انھیں تعلق خاطر تھا لیکن جانب داری سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ جس طرح وہ خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں اسی طرح خامیاں بھی گنا

دیتے ہیں۔ ان کی منصف مزاجی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مثنوی گلزار نسیم کی اشاعت کے بعد جو ہنگامہ آرائی ہوئی اس میں مجبوراً انھیں بھی حصہ لینا پڑا لیکن سنجیدگی اور متانت کا دامن کبھی ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ہر طرف سے فریق مخالف پر طنز کے تیر برس رہے تھے مگر انھوں نے ہلکی سی شوخی اور ظرافت پر اکتفا کیا۔

چکبست کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کی نثر سادہ و سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دلکش ہوتی ہے۔

حامد حسن قادری

حامد حسن قادری پھپھاؤں (ضلع مرادآباد) کے رہنے والے تھے۔ مدرسۂ عالیہ رام پور سے عربی فارسی امتحانات کی سندیں حاصل کیں۔ پھر سینٹ جونس کالج آگرہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ اردو کے قدیم ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس قیمتی سرمایے کو انھوں نے تنقید کی غیر جانب دارانہ کسوٹی پر پرکھا۔ نقد و نظر اور تاریخ و تنقید ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ داستان تاریخ اردو ان کا سب سے اہم کارنامہ ہے جسے نیاز فتح پوری نے اردو نثر کی انسائیکلوپیڈیا کہا ہے۔

۱۸۸۴ء - ۱۹۶۴ء

نیاز فتح پوری

نیاز فتح پوری کا قلم بڑا زرخیز ہے۔ افسانے، انشائیے اور تنقیدی مضامین انھوں نے سبھی کچھ لکھا مگر تنقیدی مضامین نے قارئین کو خاص طور پر متوجہ کیا۔ ان کی تنقید حالی کی تنقید کی ضد ہے۔

۱۸۸۷ء - ۱۹۶۶ء

وہ شعر و ادب کی افادیت کے قائل نہیں بلکہ اسے لطف اندوزی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ یہی ان کی تنقید کی کمزوری بھی ہے۔ مطلب یہ کہ ان کی نظر ادب کی جمالیاتی اقدار سے آگے نہیں بڑھتی۔ ان کا ادبی ذوق بہت نکھرا ہوا تھا مگر وہ ہمیشہ فن کاروں کی زبان و بیان کی لغزشوں کی گرفت کرتے رہے۔ دراصل وہ رومانی اور تاثراتی تنقید نگار ہیں۔ علمیت اور شعر و ادب سے گہرے شغف کے باوجود وہ اردو تنقید کو جتنا کچھ دے سکتے تھے نہ دے سکے۔ اس کے

www.urduchannel.in

باوجود اردو تنقید نگاروں میں نیاز کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی زبان صاف شستہ اور دل نشیں ہے اور قاری کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ان کی تنقید نے شعر و ادب کا ذوق عام کیا اور ایک عرصہ تک اس ذوق کی تربیت کی۔ انتقادیات مالۂ وماعلیہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

مسعود حسن رضوی ادیب

۱۸۹۳ء۔ ۱۹۷۵ء

"ہماری شاعری" لکھ کر مسعود حسن رضوی ادیب نے اردو کے نقادوں کے درمیان اپنی جگہ بنالی ہے۔ مطالعہ اور تصنیف و تالیف آخر تک ان کی زندگی کا مقصد رہا۔

وہ ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ مختلف ملازمتیں کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی سے وابستہ ہوگئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد لکھنؤ میں ہی قیام رہا۔ ان کے پاس نادر و نایاب کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اس سے تصنیفی کاموں میں بہت مدد ملی۔ ادیب تخلص اختیار کیا تھا مگر شعر گوئی کی طرف توجہ نہ کرسکے۔ اردو شاعری پر جو اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں "ہماری شاعری" میں رضوی صاحب نے ان کا مدلل جواب دیا ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہے۔ اردو مرثیے سے انھیں بہت دلچسپی تھی۔ اس صنف سخن کے سلسلے میں تحقیق اور تنقید ان کا قابل ذکر کارنامہ ہے۔ "اردو ڈراما اور اسٹیج" بھی ان کی اہم کتاب ہے۔ انھوں نے بعض اہم متون بھی مرتب کیے جیسے ذکرِ میر، روحِ انیس، اندر سبھا دیوان فائز۔ رضوی صاحب کی نثر سادہ سلیس اور بہت دلکش ہوتی ہے۔

مجنوں گورکھپوری

۱۹۰۴ء۔ ۱۹۸۸ء

ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا ترجمے کی طرف بھی توجہ کی لیکن ان کا اصل میدان تنقید ہے۔ درس و تدریس سے ان کا زندگی بھر تعلق رہا۔ مطالعے کا بے حد شوق تھا اور حافظہ بہت اچھا پایا تھا اس لیے تنقید کا حق ادا کردیا۔ وہ نیاز سے متاثر تھے اور شروع میں ان کی تنقید تاثراتی تھی مگر وہ اس منزل پر ٹھہرے نہیں۔ دنیا میں جو انقلاب رونما ہو رہے تھے ان پر غور کرتے رہے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس نے انھیں بہت متاثر کیا۔ تاثراتی تنقید کی دلدل سے نکل کر وہ ترقی پسندوں کے ہم نوا ہوگئے۔ انھیں احساس ہوگیا کہ ادیب کوئی راہب یا جوگی نہیں۔ وہ بھی ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح اور لوگ۔

جلد ہی وہ اس تحریک سے بیزار ہوگئے۔ روس میں ادیبوں کی آزادی کو جس طرح کچلا گیا، وہ انھیں ناگوار ہوا۔ ترقی پسند ادیب جب اشتراکیت کے پروپیگنڈے کو ہی سب کچھ سمجھنے لگے تو انھوں نے اس تحریک سے کنارہ کرلیا اور کہا کہ ادب ڈھنڈورا قسم کی کوئی چیز نہیں اور ادیب ڈھنڈوریا نہیں ہوتا۔ انھوں نے بار بار کہا کہ ادب کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ادب کے تقاضوں کو پورا کرے۔ یہاں سے ان کی تنقید کا جو دور شروع ہوتا ہے وہی سب سے کامیاب ہے کہ اس زمانے میں لکھے گئے تنقیدی مضامین سائنٹفک تنقید کے دائرے میں آتے ہیں۔

نقوش و افکار، ادب اور زندگی، تنقیدی حاشیے، تاریخ جمالیات، غزل سرا، غالب شخص اور شاعر، اقبال، نکات مجنوں ان کی اہم کتابیں ہیں۔

محی الدین زور

۱۹۰۵ء۔ ۱۹۶۲ء

حیدرآباد دکن کے نامور ادیبوں میں محی الدین قادری زور کا شمار ہے۔ قیام یورپ کے زمانے میں انھوں نے اردو ادب کی بہت خدمت کی۔ اردو کی جو نادر کتابیں اور مخطوطات وہاں کتب خانوں میں موجود تھے۔ ان کا تعارف کرایا۔ حیدرآباد میں "ادارۂ ادبیات اردو" کی داغ بیل ڈالی۔ دکنی زبان و ادب کے ماہرین میں ان کا شمار ہے۔ انھوں نے دکنی ادب پر کام کرنے والوں کی ایک جماعت تیار کی اور دکنی ادب پر قابلِ قدر کام کیا اور کرایا۔

www.urduchannel.in

عثمانیہ کالج سے بی۔اے اور ایم۔اے کرنے کے بعد ریاست کے وظیفے پر انگلستان پھر وہاں سے پیرس گئے۔ پی۔ایچ۔ڈی لندن سے کیا۔ لسانیات و صوتیات ان کا موضوع تھا۔ واپس آکر وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو سے منسلک ہوگئے۔ بعد کو کالج کے پرنسپل اور چادر گھاٹ کالج میں صدر شعبہ رہے۔ سبکدوشی کے بعد کشمیر یونی ورسٹی سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۶۲ء میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ تنقید و تحقیق کے سلسلے میں انھوں نے متعدد کام کیے۔ روحِ تنقید، تنقیدی مقالات، حیاتِ قلی قطب شاہ، داستانِ ادب حیدرآباد ان کی اہم کتابیں ہیں۔ بعض شعرا کے دیوان ترتیب دے کر شائع کرائے۔

سید عبداللہ

۱۹۰۶ء -- ۱۹۸۶ء

سید عبداللہ ایک کہنہ مشق اور دیدہ ور نقاد ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے، رائے میں توازن اور نثر میں دلکشی ہے۔ انھوں نے انگریزی اردو دونوں زبانوں میں لکھا اور داد و تحسین حاصل کی۔

ان کا وطن ہزارہ (پنجاب) ہے۔ وہیں ابتدائی تعلیم ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم اورینٹل کالج لاہور میں حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرکے پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں کلرک ہوگئے۔ آخر کالج کے پرنسپل اور پنجاب یونی ورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسی منصب سے ریٹائر ہوئے۔

ابتدا میں ان کا رجحان تحقیق کی طرف تھا اور اردو کے علاوہ عربی فارسی ادب بھی ان کے دائرہ کار میں شامل تھا۔ بعد میں تنقید کی طرف مائل ہوئے۔ تنقید میں اعتدال و توازن کا راستہ اختیار کیا۔ مشرقی ادب کے علاوہ مغربی ادب پر بھی ان کی نظر ہے اس سے تنقید میں گہرائی پیدا ہوئی۔ ان کی زبان بہت دلکش ہوتی ہے۔ اس صفت نے بھی ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ پندرہ برس کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ اس لیے زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل ہوگئی۔ بحث و نظر، مباحث، ولی سے اقبال تک، سرسید اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، شعرائے اردو کے تذکرے ان کی اہم تصانیف ہیں۔

کلیم الدین احمد

۱۹۰۸ء -- ۱۹۸۳ء

کلیم الدین احمد اردو تنقید میں ایک بت شکن کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے تنقید کے میدان میں قدم رکھا تو اردو دنیا میں زلزلہ سا آگیا۔ ایک تنقید نگار کے الفاظ میں وہ ایوانِ ادب میں اس طرح داخل ہوئے جیسے کوئی مست ہاتھی شیشہ گر کی دکان میں گھس جائے۔

ان کا وطن پٹنہ (بہار) ہے۔ تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ مزید تعلیم کے لیے کیمبرج یونیورسٹی (انگلستان) گئے۔ واپس آکر پٹنہ یونی ورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر اور بعد میں صدر مقرر ہوگئے۔ ۱۹۵۲ء میں پرنسپل کے منصب پر فائز ہوئے۔ اس سے تقریباً پانچ سال بعد ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے عہدے پر مامور ہوئے۔

ان کی تنقید دراصل مغربی ادب اور خاص طور پر انگریزی ادب کے زیرِ اثر وجود میں آئی۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ان کا قیام انگلستان میں رہا۔ وہاں انگریزی ادب کا مطالعہ کیا۔ ایف۔آر۔ لیوس جیسے بلند پایہ نقاد سے فیض اٹھایا اور جب ہندوستان لوٹے تو آنکھوں پر ایسی عینک چڑھ چکی تھی جس سے اپنی زبان کا ادبی سرمایہ حقیر و بے وقعت نظر آتا تھا۔ لیکن شدت اور سخت گیری کے باوجود کلیم الدین احمد کی تنقید سے اردو ادب کو بہت فائدہ پہنچا۔ انھوں نے اردو تنقید کی جس طرح رہنمائی کی اور اس کے سرمایے میں جو بیش قیمت اضافہ کیا اسے ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ وہ ہمارے عہد کے چند بڑے نقادوں میں سے ایک ہیں۔

ان کی تنقید یک رخی ہے۔ وہ اپنے ادب کو انگریزی ادب کے ہم پلہ دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اسی لیے ان کی تنقید میں جا بجا برہمی کا اظہار ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادب سے وہ اس لیے ناخوش تھے کہ وہاں حسن کاری معدوم تھی۔ اشتراکیت کے پرچار کو ہی ان لوگوں نے سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے ادب کی ادبیت اور آفاقی قدروں پر زور دیا۔ ان کا تنقیدی شعور برابر ارتقا پذیر رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مغربی ادب سے مرعوبیت اور فیصلے میں

www.urduchannel.in

عجلت کی عادت کم ہوتی گئی۔ شدت اور انتہا پسندی کی جگہ رفتہ رفتہ اعتدال و توازن نے لے لی۔ ان کا تنقیدی کارنامہ صدیوں تک انھیں زندہ رکھنے کی ہوتی ہے۔

اردو شاعری پر ایک نظر، اردو تنقید پر ایک نظر، عملی تنقید، سخنہائے گفتنی اور فنِ داستان گوئی ان کی چند اہم کتابیں ہیں۔

اختر اورینوی

۱۹۱۰ء - ۱۹۷۷ء

اختر اورینوی کی ادبی کاوشوں سے اردو ادب میں بہار کا نام بلند ہوا۔ افسانہ، ناول، ڈراما، شاعری — ان سب اصناف میں انھوں نے خامہ فرسائی کی لیکن تنقید بھی ان کی توجہ سے محروم نہیں رہی اور اس میدان میں بھی انھوں نے قابلِ قدر کام کیا۔

اورینی ضلع مونگیر (بہار) ان کا وطن ہے۔ اسی مناسبت سے وہ اختر اورینوی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ پورا نام سید اختر احمد تھا۔ فارسی عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر جدید تعلیم کا آغاز ہوا۔ سائنس پڑھی اور میڈیکل کالج میں داخلہ لیا لیکن بیماری کے سبب تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ صحتیاب ہونے پر اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر پٹنہ کالج میں لکچرر ہو گئے۔ پھر ترقی کر کے پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو ہوئے۔

اختر اورینوی کی تنقید میں بہت توازن نظر آتا ہے۔ ادبی و معاشرتی ماحول، فن کار کی انفرادیت، معاشی حالات کو وہ نظر انداز نہیں کرتے لیکن ادب کے فنی تقاضوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ادب کی سماجی اہمیت کے قائل نہیں لیکن یہ غلط فہمی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ ادب کو ادب کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ تنقید کے علاوہ انھوں نے بہار میں اردو شعر و ادب کے ارتقا پر بھی بہت کام کیا ہے۔ اختر اورینوی کا اسلوب شگفتہ و دلکش ہے۔

کسوٹی، تحقیق و تنقید، تنقید جدید، قدر و نظر اور سراج و منہاج ان کی اہم کتابیں ہیں۔

احتشام حسین

۱۹۱۲ء - ۱۹۷۲ء

بقول محمد حسن: پچھلے پینتیس چالیس سال سے اردو تنقید پر صرف ایک نقاد کی حکمرانی رہی ہے۔ سید احتشام حسین کی۔ یہ حکمرانی جابرانہ اور آمرانہ نہیں تھی بلکہ ایک ایسے ہمدرد اور دوست کی تھی جو دھیرے دھیرے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔

سید احتشام حسین کی ولادت ماہل ضلع اعظم گڈھ اتر پردیش میں ہوئی۔ اعظم گڈھ اور الہ آباد میں تعلیم پائی۔ تصنیفی زندگی کا آغاز ۱۹۳۲ء کے قریب ہوا۔ ناٹک لکھے، نظمیں کہیں لیکن طبیعت کا رجحان تنقید کی طرف تھا۔ ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی میں لکچرر ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر و صدر مقرر ہوئے۔ اسی یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے۔

احتشام حسین کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ادب کے علاوہ جملہ سماجی علوم خاص طور پر تاریخ، سیاست، اقتصادیات اور عمرانیات وغیرہ پر ان کی نظر گہری ہے۔ مزاج میں سنجیدگی اور غور و فکر عادت ہے۔ ان سب سے مدد لیے بغیر کسی فیصلے پر نہیں پہنچتے لیکن جب کسی فیصلے پر پہنچ جاتے ہیں تو نہایت مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک بار انھوں نے مارکسزم کے راستے کا انتخاب کر لیا تو ساری زندگی اس سے منھ نہیں موڑا۔ ان پر کٹر پن اور شدت پسندی کے الزامات لگے۔ کہا گیا کہ انھوں نے ایک اٹل عقیدے پر ساری توجہ صرف کر دی اور باقی ہر حقیقت کو نظر انداز کر دیا۔ مگر سخت سے سخت اعتراضات بھی ان کے قدموں کو ڈگمگا نہیں سکے۔

ان کے تنقیدی مضامین کی ایک بڑی خوبی ان کا سلجھا ہوا، واضح، سنجیدہ اور مدلل اندازِ بیان ہے۔ انھوں نے خالص علمی نثر کو اپنی تنقید کے لیے اپنایا اور صاف ستھری غیر مبہم زبان میں اپنی بات کہی۔

تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، ادب اور سماج، تنقید اور عملی تنقید،

www.urduchannel.in

ذوق ادب اور شعور، افکار و مسائل، عکس اور آئینے، اعتبارِ نظر، ان کی اہم تصانیف ہیں۔

آل احمد سرور

ولادت ۱۹۱۲ء

آل احمد سرور ہمارے عہد کے سب سے سربرآوردہ نقاد ہیں اور موجودہ نسل کے ادبی مذاق کی تربیت میں ان کے تنقیدی مضامین کا بڑا حصہ ہے۔ اس زمانے میں جب اردو تنقید مختلف قسم کی گمراہیوں میں مبتلا تھی پروفیسر سرور نے رہبری کا اہم فریضہ انجام دیا۔ جب ہمارے تنقید نگار گروہوں میں تقسیم تھے اور جب ادب کو کسی نہ کسی خانے میں رکھ کر کسی ایک زاویے سے دیکھنے کا رواج عام تھا انھوں نے ادب کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت کا احساس دلایا اور اپنے مضامین کے ذریعے اہلِ نظر میں یہ ذوق پیدا کیا کہ وہ شعر و ادب کو سب سے پہلے شعر و ادب کی کسوٹی پر پرکھیں اور ادب میں ادبیت تلاش کریں۔

ان کا سال ولادت ۱۹۱۲ء اور وطن بدایوں ہے مگر والد پوسٹ آفس کی ملازمت میں تھے اور تبادلہ ہوتا رہتا تھا اس لیے بچپن پیلی بھیت، بدایوں، گونڈہ، غازی پور وغیرہ مقامات پر گزرا۔ اسی طرح تعلیم بھی مختلف جگہوں پر ہوئی۔ آگرہ سے بی۔ ایس سی۔ کیا لیکن ایم۔ اے۔ کے لیے انگریزی اور اردو کا انتخاب کیا تعلیم سے فارغ ہو کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی سے وابستہ ہو گئے۔ پھر شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئے۔ رام پور میں پرنسپل اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر بھی رہے۔ ۱۹۵۵ء میں اردو کے پروفیسر ہو کر علی گڑھ آئے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ علی گڑھ میں ملازمت کے دوران ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور پرووسٹ بھی رہے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر کے ڈائرکٹر ہو کر سری نگر (کشمیر) چلے گئے۔ وہاں سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ میں مستقل رہایش اختیار کر لی اور شعبۂ اردو کے پروفیسر ایمریٹس کا اعزازی منصب قبول کر لیا۔

سرور صاحب ایک غیر جانبدار، منصف مزاج اور کھلا ذہن رکھنے والے نقاد ہیں۔ انھوں نے خود کو کسی گروہ سے وابستہ نہیں کیا اور کبھی آزادیِ فکر و نظر کا سودا نہیں کیا۔

انقلاب روس کے نتیجے میں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو انھوں نے اس تبدیلی کو وقت کا تقاضا قرار دیا اور اس کا خیر مقدم کیا لیکن جب ترقی پسند ادب ادب نہیں رہا تو وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ میں ادب کا مقصد نہ ذہنی عیاشی سمجھتا ہوں نہ اشتراکیت کا پرچار۔

سرور صاحب کی تنقید کا ایک خاص وصف ان کا دل نشین اسلوب ہے جس میں سادگی بھی ہے اور رعنائی بھی۔ ان کی تنقید اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کیے بغیر تخلیق کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے جس سے تنقیدی بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے اور ایک طرح کا ذہنی سرور و انبساط بھی۔

تنقید کیا ہے، ادب اور نظریہ، نئے اور پرانے چراغ، تنقیدی اشارے، نظر اور نظریے، مسرت سے بصیرت تک اور دانش و اقبال ان کی اہم کتابیں ہیں۔

اختر حسین رائے پوری

۱۹۱۲ء -

ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر ان کی زندگی گزری۔ ان مقامات میں کلکتہ، علی گڑھ اور دہلی شامل ہیں۔ آخر ریاست حیدر آباد نے ایک گراں قدر وظیفہ عنایت کیا جس سے وہ پیرس گئے اور ڈی۔ لٹ۔ کی ڈگری لے کر واپس آئے۔ واپس آکر آل انڈیا ریڈیو دہلی میں، پھر شعبۂ تعلیم میں بحیثیت جائنٹ سکریٹری کام کرتے رہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان جا کر شعبۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔

وسیع مطالعے اور یورپ میں قیام کے سبب ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور ان کی تنقید میں اس کا اظہار ہوا۔ اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے انھوں نے اہلِ نظر کے ایک بڑے حلقے کو اپنا ہم خیال بنایا۔ ادب اور انقلاب، سنگ میل ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز میں "ناخدا" کے قلمی نام سے رسالہ "اردو" میں کتابوں پر تبصرے کیے جو بہت مقبول ہوئے۔ ان کی مقبولیت میں دلکش

www.urduchannel.in

انداز بیان کو بڑا دخل ہے۔

ممتاز حسین

ممتاز حسین مارکسی نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ پارہ ضلع غازی پور ان کی جائے پیدایش ہے۔ اپنے قصبے سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد الہ آباد آئے اور بی۔ اے۔ تک تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ ٹی۔ اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ کیا۔ مختلف مقامات پر ملازمت کرنے کے بعد مستقل طور پر کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔

۱۹۱۷ء -

لگاتار مطالعہ اور مستقل غور و فکر ممتاز حسین کی عادت بن گئی تھی۔ انھوں نے ادب کا مطالعہ بہت توجہ سے کیا۔ تاریخ اور فلسفہ ان کے پسندیدہ مضامین رہے۔ اس لیے جب انھوں نے قلم اٹھایا تو نہایت پختہ خیالات قارئین کے سامنے پیش کیے۔ اشتراکیت نے انھیں بہت متاثر کیا اور مارکسی نقادوں کی فہرست میں شامل ہونے کو لائق فخر جانا۔ زبان و بیان پر انھیں پوری طرح گرفت حاصل نہیں اس لیے اکثر الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے خیالات کو قطعیت کے ساتھ ادا نہیں کر پاتے۔

نقد حیات، نئے گوشے، ادب اور شعور، تنقیدی مسائل اور نئی قدریں ان کی تصانیف ہیں۔

وقار عظیم

افسانوی ادب پر ان کے تنقیدی افکار کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وطن میرٹھ ہے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ کے ایک مکتب اور پھر اسکول میں ہوئی۔ بی۔ اے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے اور ایم۔ اے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دنوں "آج کل" کے ایڈیٹر رہے۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی چلے گئے اور رسالہ "ماہ نو" کی ادارت قبول کر لی۔ پھر اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہو گئے۔

۱۹۱۸ء - ۱۹۷۶ء

کم عمری سے ہی تنقید نگاری کا شوق تھا۔ "ہمارے افسانے" اور "افسانہ نگاری" اس زمانے میں لکھی گئیں جب وقار عظیم طالب علم تھے۔ تعلیم کے بعد تو انھوں نے تصنیف کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ افسانوی ادب کی تنقید ان کا خاص موضوع ہے۔ زبان سیدھی سادی ہے اور خیالات واضح۔ اس لیے وہ قارئین کو بہ آسانی اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ افسانہ نگاری، ہمارے افسانے، ہماری دو کتابیں، داستان سے افسانے تک، نیا افسانہ، فن اور فن کار ان کی تصانیف ہیں۔

محمد حسن عسکری

انگریزی ادب کے معلم تھے اس لیے انھیں بطور خاص انگریزی ادب کے مطالعے کا موقع ملا۔ فرانسیسی ادب سے بھی آگہی حاصل کی لیکن مغربی ادب انھیں مرعوب نہیں کر سکا۔ مشرقی ادب انھیں بہتر و برتر نظر آیا اور آخر کار انھوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ ان کے نظام تنقید میں تہذیب کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کی برتری کے قائل ہیں اور ادب میں اس کی کارفرمائی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے نفرت ہے اور اکثر اس پر طنز کرتے ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلوں کو سیدھے سادے لفظوں میں بیان کر دینے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے۔

۱۹۱۹ء - ۱۹۷۸ء

خورشید الاسلام

خورشید الاسلام کا اسلوب بڑا دلفریب ہے۔ شاید اسی لیے انھیں تاثراتی نقاد کہا جاتا ہے مگر یہ پوری طرح درست نہیں۔ وہ ادب کا ہر زاویے سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی بھی انھوں نے حمایت کی لیکن جب وہ شدت پسندی کا شکار ہو گئی تو اس سے مایوس ہو گئے۔ شخصی آزادی کو وہ شعر و ادب کے فروغ کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ تنقید کو فن پارے کی تخلیق دگر مانتے ہیں اور جمالیاتی اقدار کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کی تنقید کا کینوس وسیع ہے۔ "تنقیدیں" اور "غالب" ان کی اہم تصانیف ہیں۔

ولادت - ۱۹۱۹ء

www.urduchannel.in

انداز بیان کو بڑا دخل ہے۔

ممتاز حسین

۱۹۱۷ء۔

ممتاز حسین مارکسی نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ بارہ ضلع غازی پور ان کی جائے پیدائش ہے۔ اپنے قصبے سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد الہ آباد آئے اور بی۔ اے۔ تک تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ ٹی۔ اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ کیا۔ مختلف مقامات پر ملازمت کرنے کے بعد مستقل طور پر کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔

لگاتار مطالعہ اور مستقل غور و فکر ممتاز حسین کی عادت بن گئی تھی۔ انھوں نے ادب کا مطالعہ بہت توجہ سے کیا۔ تاریخ اور فلسفہ ان کے پسندیدہ مضامین رہے۔ اس لیے جب انھوں نے قلم اٹھایا تو نہایت پختہ خیالات قارئین کے سامنے پیش کیے۔ اشتراکیت نے انھیں بہت متاثر کیا اور مارکسی نقادوں کی فہرست میں شامل ہونے کو لائق فخر جانا۔ زبان و بیان پر انھیں پوری طرح گرفت حاصل نہیں اس لیے اکثر الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے خیالات کو قطعیت کے ساتھ ادا نہیں کر پاتے۔

نقدِ حیات، نئے گوشے، ادب اور شعور، تنقیدی مسائل اور نئی قدریں ان کی تصانیف ہیں۔

وقار عظیم

۱۹۱۸ء۔ ۱۹۷۶ء

افسانوی ادب پر ان کے تنقیدی افکار کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وطن میرٹھ ہے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ کے ایک مکتب اور پھر اسکول میں ہوئی۔ بی۔ اے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے اور ایم۔ اے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دنوں "آج کل" کے ایڈیٹر رہے۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی چلے گئے اور رسالہ "ماہِ نو" کی ادارت قبول کر لی۔ پھر اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہو گئے۔

کم عمری سے ہی تنقید نگاری کا شوق تھا۔ "ہمارے افسانے" اور "افسانہ نگاری" اس زمانے میں لکھی گئیں جب وقار عظیم طالب علم تھے۔ تعلیم کے بعد تو انھوں نے تصنیف کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ افسانوی ادب کی تنقید ان کا خاص موضوع ہے۔ زبان سیدھی سادی ہے اور خیالات واضح۔ اس لیے وہ قارئین کو بہ آسانی اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ افسانہ نگاری، ہمارے افسانے، ہماری داستانیں، داستان سے افسانے تک، نیا افسانہ، فن اور فن کار ان کی تصانیف ہیں۔

محمد حسن عسکری

۱۹۱۹ء۔ ۱۹۷۸ء

انگریزی ادب کے معلم تھے اس لیے انھیں بطور خاص انگریزی ادب کے مطالعے کا موقع ملا۔ فرانسیسی ادب سے بھی آگہی حاصل کی لیکن مغربی ادب انھیں مرعوب نہیں کر سکا۔ مشرقی ادب انھیں بہتر و برتر نظر آیا اور آخر کار انھوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ ان کے نظامِ تنقید میں تہذیب کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کی برتری کے قائل ہیں اور ادب میں اس کی کارفرمائی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے نفرت ہے اور اکثر اس پر طنز کرتے ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلوں کو سیدھے سادے لفظوں میں بیان کر دینے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے۔

خورشید الاسلام

ولادت۔ ۱۹۱۹ء

خورشید الاسلام کا اسلوب بڑا دلفریب ہے۔ شاید اسی لیے انھیں تاثراتی نقاد کہا جاتا ہے مگر یہ پوری طرح درست نہیں۔ وہ ادب کا ہر زاویے سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی بھی انھوں نے حمایت کی لیکن جب وہ شدت پسندی کا شکار ہو گئی تو اس سے مایوس ہو گئے۔ شخصی آزادی کو وہ شعر و ادب کے فروغ کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ تنقید کو فن پارے کی تخلیق دگر مانتے ہیں اور جمالیاتی اقدار کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کی تنقید کا کینوس وسیع ہے۔ "تنقیدیں" اور "غالب" ان کی اہم تصانیف ہیں۔

www.urduchannel.in

محمد حسن
ولادت ۱۹۲۵ء

محمد حسن زندگی اور سماج سے ادب کے گہرے تعلق کے قائل ہیں۔ آرٹ کو سماج کا معمار، اخلاق کا معلم اور سیاست کا رہبر مانتے ہیں مگر اسے کسی تنگ دائرے میں قید کرنے کے روادار نہیں اور کسی بھی حالت میں ان قدروں کو نظر انداز کرنے پر راضی نہیں جو فن کو ابدیت اور آفاقیت عطا کرتی ہیں۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ "آرٹ کا پہلا کام جمالیاتی احساس کی تسکین ہے"۔ عبارت آرائی سے انھوں نے ہمیشہ پرہیز کیا اور اپنی بات کو واضح مدلل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود ان کی نثر دلکشی کے وصف سے محروم نہیں۔ ادبی تنقید، شعر فہمی، اردو شاعری کا فکری و تہذیبی پس منظر، عرض ہنر، جدید اردو ادب، شناسا چہرے، معاصر ادب کے پیش رو اور ادبی سماجیات ان کی تصانیف ہیں۔

گوپی چند نارنگ
ولادت ۱۹۳۱ء

گوپی چند نارنگ ہمارے دور کے بلند پایہ نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ وہ ادب کو ادب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسے قدیم و جدید اور ترقی پسند و غیر ترقی پسند کے دائروں میں قید کرنے کے قائل نہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کا مطالعہ صرف اردو ادب تک محدود نہیں بلکہ بعض دوسری زبانوں کا ادب بھی ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ جدیدیت کی تحریک کو جن نقادوں نے فلسفیانہ اساس فراہم کی ان میں ایک اہم نام پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہے۔ اسلوبیات ان کا خاص موضوع ہے اور ان کی رائے ہے کہ ادبی تنقید میں جو مدد اسلوبیات سے مل سکتی ہے وہ کسی دوسرے ضابطۂ علم سے نہیں مل سکتی۔

شمس الرحمٰن فاروقی
ولادت ۱۹۳۵ء

فاروقی ہماری زبان کے ایک قدآور ناقد ہیں۔ تنقید کے میدان میں قدم رکھے انھیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس مختصر عرصے میں انھوں نے بہت لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے۔ تنقید کے موضوع پر اب تک ان کی نصف درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو کے قدیم و جدید سرمایے کے علاوہ عالمی ادب پر بھی ان کی نظر گہری ہے۔ افسانے پر بھی انھوں نے بہت کام کیا ہے لیکن افسانے کو شاعری سے کم تر خیال کرتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں انھوں نے وہی زبان استعمال کی ہے جو تنقید کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ لفظ و معنی، شعر غیر شعر اور نثر، عروض آہنگ اور بیان، افسانے کی حمایت میں، تنقیدی افکار اور شعر شور انگیز ان کی تصانیف ہیں۔

وزیر آغا
ولادت ۱۹۲۲ء

وزیر آغا نے روش عام سے ہٹ کر اپنی تنقید کا راستہ نکالا۔ تہذیب اور کلچر کے علاوہ نفسیات اور دیومالا وہ اہم زاویے ہیں جن سے انھوں نے اردو ادب کو دیکھا اور پرکھا۔ لیکن تنقید کے باقی حربوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مذہبیات اور انتھروپالوجی سے بھی مدد لی۔ فن پارے کو وہ مرکزی حیثیت دیتے ہیں اور جس زاویے سے دیکھے جانے کا وہ مطالبہ کرتا ہے اسے پورا کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان شگفتہ اور مدلل ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی تحریریں دلچسپ، پر اثر، فکر انگیز اور ساتھ ہی عالمانہ سنجیدگی سے معمور ہیں۔ اردو ادب میں طنز و مزاح، نظم جدید کی کروٹیں، اردو شاعری کا مزاج، تخلیقی عمل، تنقید اور احتساب، تصورات عقل و خرد ان کی اہم کتابیں ہیں۔

قمر رئیس
ولادت ۱۹۳۲ء

قمر رئیس اردو ادب میں پریم چند اور افسانوی ادب کے ماہر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اس سلسلے میں جو تنقیدی مضامین ان کے قلم سے نکلے ہیں انھیں اردو تنقید میں استناد کا رتبہ حاصل ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں لیکن ان کا نقطۂ نظر نہایت متوازن ہے۔ تاہم وہ ادب کو ایک سماجی فعل مانتے ہیں اور اسی لیے ترسیل و ابلاغ کو ادب کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کی نثر واضح، شفاف اور سلجھی ہوئی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دل آویز بھی ہے۔

www.urduchannel.in

سلیم احمد

ولادت ۱۹۲۷ء

سلیم احمد نے تنقیدی نظریات و رجحانات پر بھی اظہار خیال کیا اور عملی تنقید میں بھی کارنمایاں انجام دیا۔ انھوں نے علم نفسیات سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اس لیے ان کا ذکر نفسیاتی ناقدین کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان پر شدت پسندی کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ جنس کی طرف ان کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ ان کے انداز بیان کو غیر علمی، غیر سنجیدہ بلکہ زہرناک جیسے نام بھی دیے گئے۔ کہا گیا کہ وہ تنقید نہیں کرتے، فقرے بازی کرتے ہیں، پھبتیاں کستے ہیں۔ ان کی تنقید میں طنز نگاری کا عنصر بھی شامل ہے اور جن تخلیقات کو وہ پسند نہیں کرتے ان کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

عنوان چشتی

عہد حاضر کے معتبر نقادوں میں ایک اہم نام عنوان چشتی کا ہے۔ اردو شاعری ان کی توجہ کا خاص مرکز ہے۔ سب سے پہلے ان کی نظر شعر کے فنی پہلو پر جاتی ہے اور وہ اسے عروض و قواعد کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اظہار کے جملہ وسائل کے تجزیے کے بعد وہ شعر کے معنوی پہلو پر غور کرتے ہیں۔

وہاب اشرفی

عالمی ادب پر وہاب اشرفی کی نظر بہت گہری ہے اور عالمی تنقید کے جدید رجحانات سے وہ پوری طرح باخبر ہیں۔ اس لیے ان کی تنقید میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی۔ امریکی نقادوں کا ان پر گہرا اثر ہے۔ تنقید کا قدیم مشرقی انداز انھیں پسند نہیں۔ وہ تجزیہ و تحلیل سے کام لینے کے عادی ہیں۔

وارث علوی

اردو کے ایک بے باک نقاد جنھوں نے بڑی جرأت مندی کے ساتھ اپنی ناقدانہ آرا پیش کیں اور نزاعی موضوعات پر بے جھجک لکھا اور اتنا لکھا کہ خود نزاع کا موضوع بن گئے۔ ان کا مطالعہ بالخصوص مغربی ادبیات کا مطالعہ بہت وسیع ہے لیکن اسلوب میں طنز و استہزا کی فراوانی سنجیدہ ذہنوں پر گراں گزرتی ہے۔

ممتاز حسین

مشہور مارکسی نقاد جن کی تحریروں نے ترقی پسند ادب کو مقبول بنانے میں نہایت اہم رول ادا کیا سیدھے سادے انداز میں اپنے خیالات مدلل انداز میں پیش کیے۔ تنقیدی شعور پختہ ہے لیکن ساری زندگی ادب کو صرف ایک ہی عینک سے دیکھتے رہے۔

سید محمد عقیل

مارکسی نقاد جنھوں نے شعر و ادب کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور ترقی پسند رجحان کی اشاعت میں مدد کی۔ ان کا مطالعہ وسیع اور انداز بیان سلجھا ہوا ہے اس لیے بہت آسانی سے قاری کو اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔

عبدالمغنی

ایک وسیع المطالعہ نقاد ہیں۔ شعر و ادب میں اخلاقی اقدار کی جستجو ان کا بنیادی مقصد ہے۔ اس کوشش میں اکثر ادب کا فنی اور جمالیاتی پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے۔ مغرب کی اندھی تقلید انھیں ناگوار ہے اور مشرقی روایات کے وہ بہت قائل ہیں۔

شمیم حنفی

اس عہد کے ایک اہم نقاد جنھوں نے اپنی تحریروں سے جدیدیت کی تحریک کی وضاحت کی اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ مغرب کے جدید تنقیدی نظریات سے گہری واقفیت نے ان کی تصانیف کو وزن و وقار عطا کیا۔

لطف الرحمٰن

انھوں نے اپنے عہد کے ادب کو نئی تنقید کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے جدیدیت، وجودیت اور ادب کے باہمی رشتے کو واضح کیا ہے اور اپنی زبان کی اہم تخلیقات کو عالمی اور آفاقی تناظر میں کامیابی کے ساتھ پرکھا ہے۔

انور سدید

اردو کے اہم نقاد و مصنف "اردو ادب کی تحریکیں" کے عنوان سے ڈاکٹوریٹ کا مقالہ لکھا۔ معاصر ادب پر مسلسل تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ صنف انشائیہ کو مقبول بنانے میں ان کی تحریروں کو بہت دخل ہے۔

www.urduchannel.in

ممتاز حسین مشہور مارکسی نقاد جن کی تحریروں نے ترقی پسند ادب کو مقبول بنانے میں نہایت اہم رول ادا کیا سیدھے سادے انداز میں اپنے خیالات مدلل انداز میں پیش کیے۔ تنقیدی شعور پختہ ہے لیکن ساری زندگی ادب کو صرف ایک ہی عینک سے دیکھتے رہے۔

سید محمد عقیل مارکسی نقاد جنھوں نے شعر و ادب کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور ترقی پسند رجحان کی اشاعت میں مدد کی۔ ان کا مطالعہ وسیع اور اندازِ بیان سلجھا ہوا ہے اس لیے بہت آسانی سے قاری کو اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔

عبدالمغنی ایک وسیع المطالعہ نقاد ہیں۔ شعر و ادب میں اخلاقی اقدار کی جستجو ان کا بنیادی مقصد ہے۔ اس کوشش میں اکثر ادب کا فنی اور جمالیاتی پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے۔ مغرب کی اندھی تقلید انھیں ناگوار ہے اور مشرقی روایات کے وہ بہت قائل ہیں۔

شمیم حنفی اس عہد کے ایک اہم نقاد جنھوں نے اپنی تحریروں سے جدیدیت کی تحریک کی وضاحت کی اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔ مغرب کے جدید تنقیدی نظریات سے گہری واقفیت نے ان کی تصانیف کو وزن و وقار عطا کیا۔

لطف الرحمٰن انھوں نے اپنے عہد کے ادب کو نئی تنقید کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے جدیدیت، وجودیت اور ادب کے باہمی رشتے کو واضح کیا ہے اور اپنی زبان کی اہم تخلیقات کو عالمی اور آفاقی تناظر میں کامیابی کے ساتھ پرکھا ہے۔

انور سدید اردو کے اہم نقاد و مصنف "اردو ادب کی تحریکیں" کے عنوان سے ڈاکٹوریٹ کا مقالہ لکھا۔ معاصر ادب پر مسلسل تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ صنف انشائیہ کو مقبول بنانے میں ان کی تحریروں کو بہت دخل ہے۔

ابوالکلام قاسمی تنقید کے مشرقی نظریات پر ان کی گرفت مضبوط ہے اور علمائے مغرب کے افکار سے بھی مکمل واقفیت ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین میں تجزیہ و تحلیل کا رجحان غالب ہے۔ شاعری اور افسانوی ادب ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔

نئی نسل کے ابھرتے ہوئے نقادوں میں عتیق اللہ، شمس الحق عثمانی اور قمر الہدیٰ فریدی کے نام اہم ہیں۔ فریدی ابھی اس میدان میں نووارد ہیں لیکن کئی قابلِ قدر تصانیف پیش کر کے انھوں نے معتبر نقادوں کے درمیان اپنی جگہ بنا لی ہے۔